ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

مارچ ۲۰۰۱ء

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

Safety Sealers *for*

FULL PROTECTION

From Foundation to Roof Top

Dampcourse Sheeting 13" & 9" to BS 6398:83

Damp Wall Coating to ASTM D-2822

Sealocrete Waterproofing Powder & ADMIXTURES

Oxy Bit Range of Oxidised Bitumens

Roofing Felts to BSS & ASTM SPEC

Safetorch 3 to 5 MM Torch on Membranes

Joint Sealants for Buildings & Structure Water Retaining

Jet Fuel Resistant Sealing for Runways

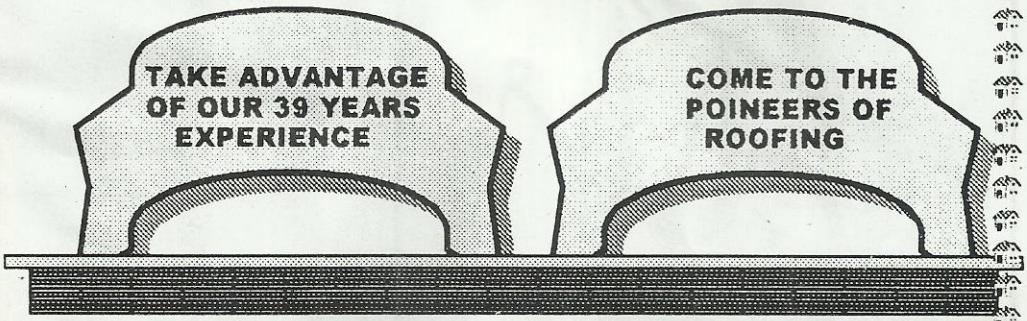

SAFETY SEALERS (PVT) LTD.

Ist Floor Galaxy Shopping Centre, 115-Ferozepur Road, Lahore-Pakistan
Tel Office:417254-7573615
KARACHI OFFICE:2/13-A, Commercial Area, P.E.C.H.S.
Karachi-Pakistan Tel:4944059
QUETTA: 12 A Nursery Lines
Ph:836778

مجلّہ طلوعِ اسلام کا اجراء 1938ء میں علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر عمل میں آیا

قُرآنی نظامِ رُبُوبّیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدل اشتراک
سالانہ
پاکستان -/170 روپے
غیر ممالک -/800 روپے

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور ۵۴۶۶۰
ٹیلی فون: 5714546-5753666
idara@toluislam.com

قیمت فی پرچہ
-/15
روپے

Bank Account Number 3082-7 National Bank of Pakistan, Main Market Gulberg Branch, Lahore

جلد 54 | مارچ 2001ء | شمارہ نمبر 03

ایڈیٹر
محمد سلیم اختر

مجلس مشاورت
ڈاکٹر صلاح الدین اکبر
بشیر احمد عابد
محترمہ شمیم انور

اکاؤنٹینٹ ---- محمد زمرد بیگ
کمپوزر ---- شعیب حسین

انتظامیہ
چیئرمین ---------- ایاز حسین انصاری
ناظم ---------- اقبال ادریس
ناشر ---------- عطاء الرحمان ارائیں

قانونی مشیر
عبداللہ ثانی ایڈووکیٹ
ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ
محمد اقبال چوہدری ایڈووکیٹ

پرنٹرز: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ، لاہور - فون: 7232584

فہرست

لمعات

(i) تحریک پاکستان اور طلوع اسلام	بشیر احمد عابد	3
(ii) بدبخت یہودی بن زاک کی دریدہ ذہنی	محمد سلیم اختر	10
محشرستان فلسطین	ادارہ	13
مکتوب پرویز	غلام احمد پرویزؒ	24
کیریکٹر کی اہمیت اور جدید سائنس	ڈاکٹر منصور الرحمٰن	33
اقبال! ترے دیس کا کیا حال سناؤں	امیر الاسلام ہاشمی	36
نغمۂ رحمت	ملک حنیف وجدانی	41

ENGLISH

Voice of Youth
An Introduction to Philosophy
By Asif Iqbal Khawaja 47

Conspiracy Against the Quran
By Shamim Anwar 48

The Status of Hadith
G.A. Parwez, Translated by Abu B. Rana 64

سرورق کے لئے ادارہ محمد علی برکت صاحب کا شکر گذار ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

تحریکِ پاکستان اور طلوعِ اسلام

تاریخ کی یہ ایک فطری کمزوری ہے کہ وہ اپنے دامن میں صرف انہی کرداروں کو سمیٹتی ہے جو خود آگے بڑھ کر اپنے آپ کو پیش کریں۔ جس وقت تحریکِ پاکستان کی تاریخ مرتب ہو رہی تھی تو اس دوران کچھ کردار ایسے بھی تھے کہ جنہوں نے اگرچہ قومی سیاست میں مستانہ وار کردار ادا کیا تھا اور پاکستان مخالف قوتوں کے ہر حربے کو ناکام بنا کر سفینۂ ملت کو یقینی غرقابی سے بچا لیا تھا اور اسے ساحلِ مراد پر بحفاظت لے آئے تھے لیکن مستی کردار کے جنون میں وہ اس قدر محو رہے کہ تاریخ کے اوراق میں اپنے عظیم کارناموں کا تذکرہ کرانا تو کجا اپنے آپ کو صحیح طور پر متعارف بھی نہ کرا سکے۔ انہی بدنصیب کرداروں میں ایک طلوعِ اسلام بھی تھا۔

آج قیامِ پاکستان کے سلسلے میں جب طلوعِ اسلام کی خدمات کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو یہ اچھے دانشوروں کے چہروں پر ایک حقارت آمیز ہنسی کے آثار پیدا کر دیتا ہے۔ کچھ تو اسے طلوعِ اسلام کا طفلانہ پن سمجھتے ہیں اور کچھ اسے خودنمائی کا جذبہ قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ خودنمائی کے اظہار کا اس سے آسان نسخہ کیا ہو سکتا ہے کہ خود کو تحریکِ پاکستان کا مجاہد ثابت کر دیا جائے۔ اہلِ فکر کے نزدیک طلوعِ اسلام فکری گمراہی کا نام ہے اور علماء حضرات اسے بدعتی فرقہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ہندوستان کی بساطِ سیاست میں جب ملتِ اسلامیہ کے افراد نظریہ قومیت کے دوراہے پر پہنچ کر الگ الگ راہوں پر چل نکلے تھے اور جب سفینۂ ملت متحدہ قومیت کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکا تھا اور اس کے منتشر تختے موجوں کے ساتھ بے بسی کے عالم میں بہے چلے جا رہے تھے۔ قوم کی اجتماعیت فنا ہو چکی تھی، ان کی قوتیں باہمی تخریب و استہلاک میں صرف ہو رہی تھیں، مسلمان کا گلا مسلمان کے ہاتھوں کٹ رہا تھا اور دوسری طرف وہ عیار قوم کہ جس نے اپنے سیاسی بازیگروں سے سیکھا تھا کہ کسی قوم کو تباہ و برباد کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ان میں باہمی تفریق پیدا کر دو۔ نہایت اطمینان سے مسلمانوں کی طرف سے بے فکر ہو کر اپنی آنیوالی حکومت کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ تو ان المناک حوادث اور یاس انگیز حالات میں طلوعِ اسلام ملتِ اسلامیہ کے افقِ امید پر ایک روشن ستارہ بن کر چمکا اور امیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لئے ہوئے ان سوختہ سامانوں کی طرف بڑھتا چلا آیا۔ منتشر افراد کارواں کو پھر سے ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دی۔ اور اپنوں اور بے گانوں کی تیار کردہ ہلاکت و بربادیوں کی گھاٹیوں سے بچاتا ہوا انہیں ایک محفوظ مقام کی طرف لے آیا۔ جسے آج آزاد پاکستان کہا جاتا ہے۔

قیامِ پاکستان کیلئے طلوعِ اسلام کی خدمات کا صحیح اندازہ کرنے کیلئے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ وہ کیا جنگ تھی جو اس نے لڑی تھی اور کون سا معرکہ تھا جسے اس نے یکہ و تنہا بایں جرأت و بسالت سر کیا تھا؟ اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک اس جنگ کی علتِ غائی اور اس معرکہ کے وجوہ و اسباب سامنے نہ آئیں۔ نہ تحریکِ پاکستان کی غرض و غایت سمجھ آسکتی ہے اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا تھا؟ اور اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ مطالبہ پاکستان کی بنیاد جس دعوٰی پر تھی وہ پاکستان کے حامیوں اور مخالفوں میں کس قدر شدت کے ساتھ مابہ النزاع تھا؟

اس ضمن میں پہلے ہم فریقین کے دعوؤں کو پیش کریں گے اور پھر ان کے اعتراضات کا جائزہ لیں گے۔ متحدہ قومیت کے علمبردار جن میں ہندو' انگریز' نیشنلسٹ علماء اور سیاست دان سبھی شامل تھے دعویٰ کر رہے تھے کہ ہندوستان ایک واحد ملک ہونے کی جہت سے ایک کل (Unit) ہے اور اس میں بسنے والے تمام انسان ایک قوم ہیں۔ آزادی مل جانے کے بعد تمام ہندوستان ایک مرکز ہوگا اور تمام اہم شعبہ ہائے نظم ونسق کے اصول اس کے مرکز سے متعین ہوں گے۔ اور جمہوری اندازِ حکومت کے ماتحت یہ فیصلے اکثریت کی آراء کے تابع ہوا کریں گے۔ اس نظامِ حکومت میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔ یعنی نماز روزہ کی آزادی' قرآن پڑھوا کر ایصالِ ثواب کی آزادی' آیت الکرسی اور آیہ کریمہ کے ورد کی آزادی' داڑھی بڑھانے کی آزادی اور شلوار ٹخنے سے اوپر رکھنے کی آزادی' ختنہ اور عقیقہ کی آزادی وغیرہ وغیرہ۔ البتہ دنیاوی امور کے فیصلے اکثریت کی استصوابِ رائے سے ہوں گے۔ یعنی ملک کا اقتصادی نظام کیسا ہوگا؟ سودی کاروبار کی نوعیت کیا ہوگی؟ دولت اور زمین کی تقسیم کیسے ہوگی؟ خارجی تعلقات اور امن وجنگ کی حالت میں تعلقات کیسے ہوں گے؟ عدالتوں کا نظم ونسق کیسے ہوگا؟ جرائم کی سزا کیا ہوگی؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے نظامِ حکومت میں مسلمان کی حالت کیا ہوگی وہ بخوبی سمجھی جا سکتی ہے۔ اس نہج زندگی میں اپنے آپ کو آزاد مسلمان کہلانا تو کجا کوئی صحیح مسلمان کہلانے کا مستحق بھی نہیں رہتا۔

اس کے برعکس مطالبہ پاکستان کی بنیاد اس دعوٰی پر تھی کہ اسلام کی رو سے قومیت کا معیار اشتراکِ وطن نہیں بلکہ ایمان کا اشتراک ہے اور اس بنا پر ہندوستان میں بسنے والے مسلمان' ہندوؤں سے الگ ایک مستقل قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا' تمام ہندوستان کو ایک کل (Unit) فرض کر کے جمہوری انداز کا طرزِ حکومت مسلمانوں کیلئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ مسلمان کا نصب العین ایک ایسی منفرد حکومت کا قیام ہے جس میں قرآن کی اعلیٰ اقدار حیات اس کی عملی زندگی کو محیط ہوں۔ دین اور دنیا کی تفریق اس کے نزدیک غیر اسلامی نظریہ حیات ہے۔ واضح رہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان' مابہ النزاع مسئلہ نظریہ قومیت تھا۔ یہ سوال کہ جب اس طرح مسلمانوں کی اپنی الگ مملکت قائم ہوگئی تو اس کا نقشہ کیا ہوگا' مابہ النزاع نہیں تھا۔ جن لوگوں نے پاکستان کی مخالفت اس بنیاد پر کی تھی کہ وہاں اسلامی حکومت قائم نہیں ہو سکے گی وہ صریح گمراہی میں پڑے تھے۔ ہندوؤں کو اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ مسلمان اپنی مملکت کس نقشہ کے مطابق قائم کریں گے۔ وہ تو دوقومی نظریہ کے خلاف تھے جو مطالبہ پاکستان کی اصل بنیاد تھا۔ اور یہی وہ مسئلہ تھا جس پر مسلم لیگ نے پاکستان مخالف قوتوں سے دس سال تک لڑائی لڑی تھی۔

اس باب میں قائداعظم کا ذہن اسقدر صاف تھا کہ انہیں نہ اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش آئی اور نہ ہی اس کے پیش کرنے میں کسی قسم کا الجھاؤ پیدا ہوا۔ تجدید یاداشت کیلئے ہم انہی کے چند الفاظ کو پیش کرتے ہیں جو قائد نے ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اپنی ایک تقریر کے دوران کہے تھے۔ قائدؒ فرماتے ہیں ''پاکستان اس دن وجود میں آ گیا تھا' جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی''۔ دوقومی نظریہ کے متعلق ان کی نگاہ کتنی گہرائیوں تک پہنچی ہوئی تھی اس کا اندازہ ان کی اس تقریر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۴ء کو پنجاب سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک اجلاس میں کی۔ فرمایا ''میں نہیں سمجھتا کہ کوئی دیانتدار آدمی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ مسلمان بجائے خویش ہندوؤں سے الگ مستقل قوم ہیں''۔ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا ''ہم دونوں فرقوں میں صرف مذہب کا فرق نہیں ہے۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ضابطہ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں''۔

جداگانہ قومیت کا یہی وہ تصور تھا جس کی مخالفت ہر طرف سے انتہائی شدومد سے ہوئی۔ اس مخالفت میں اگرچہ ہندو اور انگریز پیش پیش تھے لیکن اس قسم کی مملکت کا قیام دنیا کی کسی قوم کیلئے بھی خوش آئند نہ تھا۔ لہٰذا، اس کے قیام کی مخالفت بالواسطہ یا بلاواسطہ ہر گوشے سے ہوئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہندو پورے ملک پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنا چاہتا تھا اور وہ ہرگز برداشت کرنے کو

تیار نہ تھا کہ اس کا اتنا بڑا ٹکڑا اس کے حیطۂ اقتدار سے نکل جائے۔ دوسری طرف انگریز کی سیاسی مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ہندوستان غیر منقسم ملک رہے۔ اس لئے ان دونوں کی طرف سے مطالبہ پاکستان کی مخالفت لازمی تھی۔ ان وجوہات کے علاوہ مخالفت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس نئی حکومت میں قرآنی نظام قائم ہونا تھا۔ اس نظام کو دنیا کی کوئی قوم' کوئی ملک اور کوئی مذہب برداشت نہیں کرسکتا کیونکہ اس کے قیام سے نہ ملوکیت باقی رہتی ہے نہ سیکولرازم! نہ وطنی قومیت کا وجود باقی رہتا ہے نہ امپیریلزم کا۔ نہ ڈکٹیٹرشپ باقی رہتی ہے' نہ مغربی جمہوریت۔ نہ سرمایہ داری کا نظام قائم رہتا ہے نہ کمیونزم اور اشتراکیت۔ نہ مذہبی پیشوائیت باقی رہتی ہے نہ تھیاکریسی پنپ سکتی ہے۔ دنیا نے دیکھ لیا تھا جب چودہ سو سال پہلے ایک خطہ ارض میں یہ نظام قائم ہوا تھا تو جہانِ سیاست اور دنیائے مذہب کے تمام بت کس طرح ایک ایک کرکے ٹوٹ گئے تھے۔ یہ تھا وہ حقیقی خطرہ جس کی بنا پر ہندو اور اس کے حمایتی، مطالبہ پاکستان کی مخالفت میں اسقدر مستعد تھے۔ اس باب میں ہم ان کے چند ایک چوٹی کے لیڈروں کے خیالات آپ کے سامنے پیش کرنا چاہیں گے۔ انہیں غور سے سنیئے۔

ہندو اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ہندوستان کے پہلو میں ایک خالص اسلامی حکومت قائم ہوگئی جس میں قرآن کا نظام نافذ ہو' تو اس کے درخشندہ نتائج اس قدر دلکش اور انسانیت ساز ہوں گے کہ ان کے مقابل ان کے ہاں کا مذہبی اور سیاسی نظام ایک دن بھی ٹھہر نہیں سکے گا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں:۔ ''جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہا جاتا ہے اسے ہندوستان اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہوگیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت اور اسے یکسر مٹانے کی آرزو کی ہے''۔ اسی کتاب کے ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔ ''مسلم قومیت کا خیال صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے''۔ اسی باب میں ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے سب سے بڑے لیڈر مسٹر گاندھی' جنہیں ہندو ایشور کا اوتار کہا کرتے تھے' بار بار کہتے تھے۔ ''اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو بالکل الگ الگ کر دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ۔ حکومت کا منصب یہ ہے کہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے۔ مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے'' (اخبار ہریجن مورخہ ۹ دسمبر ۱۹۴۶ء) وہ کہا کرتے تھے کہ مذہب کو سیاست کے ساتھ پیوست کر دینے کا نتیجہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ قومیں قرار دیا جا رہا ہے اور اسی بنا پر مسلمانوں کیلئے جداگانہ مملکت کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ ہندوستان ٹائمز کو بیان دیتے ہوئے فرمایا'' اگر مذہب کو اس کے مقام پر رہنے دیا جائے یعنی ایک نجی کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک مشترک عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی راہ عمل بھی مشترک ہو'' (ہندوستان ٹائمز۔ مورخہ ۹ جون ۱۹۴۰ء)۔ مذہب چونکہ متحدہ قومیت کی تشکیل وتعمیر میں ایک سنگ راہ سمجھا جاتا تھا اسلئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ جب تک ایک متحدہ مذہب وجود میں نہ آئے' مذہب کو ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت دی جائے اور اسے سیاست سے بالکل الگ رکھا جائے۔ چنانچہ کانگریس کے صدر مسٹر بوس نے آسام میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا کہ'' میں سب کچھ مسلمانوں کے حوالے کرنے کو تیار ہوں' بشرطیکہ وہ متحدہ قومیت کے نظریے کو تسلیم کریں'' اس نظریہ کی تائید کرتے ہوئے آنریبل مسٹر کے۔ ایم۔ منشی' ہوم منسٹر حکومت بمبئی نے اپنی ایک تقریر کے دوران کہا تھا کہ'' جس قدر رجحانات مذہب یا زبان یا ایسے چھوٹے چھوٹے مسائل کی بنا پر قومیت پرستی کے خلاف پیدا ہوتے ہیں۔ کانگرس ان رجحانات کی مخالفت میں ایک مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ **من حیث القوم** ہماری کمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کی طرف سے ایک واہمہ پیدا کر دیا گیا ہے کہ مذہب یا زبان کا رشتہ قومیت کے رشتے کی جگہ وجہ جامعیت ہوسکتا ہے۔ یہ ایک بڑا مہلک دھوکا ہے۔ یاد رکھیئے مذہب یا زبان کا رشتہ ہمیشہ قومیت کے بلند ترین رشتہ کے ماتحت رہنا چاہئے۔ یہ تصور ہی ہندوستان کو محکم اور آزاد بنا سکے گا''۔ (نیشنل کال مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۹۳۸ء)۔ متحدہ قومیت میں تمام

معاملات کا فیصلہ ایک ایسی جمہوری حکومت کی طرف سے ہوگا جو تمام مختلف مذاہب کے مشترکہ مجموعہ پر مشتمل ہوگی اور جمہوریت کے مطابق اکثریت کا فیصلہ ملک کا قانون بنا کرے گا اور اس جمہوریت کی بنا ہوگی۔ خالص وطنیت! کانگرس کے ایک چوٹی کے لیڈر مسٹر بولا بھائی ڈیسائی نے ایوان اسمبلی میں پکار کر کہا:-

''اب یہ ناممکن ہوگا کہ کوئی ایسا نظام حکومت قائم کیا جائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کرلیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمانی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تو تصور بھی ناممکن ہے کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظام حکومت قائم ہوسکتا ہے۔ عہدِ حاضر میں بہترین نظام حکومت کی بنا اس نظریے پر قائم ہوسکتی ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتہ میں منسلک ہوکر ایک متحدہ قومیت بن جائیں''۔

(ہندوستان ٹائمز مورخہ ۵ ستمبر ۱۹۳۸ء)

ہندوؤں کی طرف سے مطالبہ پاکستان کی مخالفت ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی۔ انہوں نے اس سکیم کے خلاف جس قدر ہنگامہ آرائی اور غوغا سرائی سے کام لیا وہ کوئی غیر متوقع اور تعجب انگیز واقعہ نہیں۔ تعجب تو بلکہ اس بات پر ہوتا اگر وہ خاموش رہتے۔ ہندو کی تمام جدوجہد اس امر کے حصول کیلئے تھی کہ وہ ہندوستان میں اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر ہندو راج قائم کرکے اپنی صدیوں کی غلامی کا انتقام مسلمان اور تنہا مسلمان سے لے۔ اس نے جب دیکھا کہ مطالبہ پاکستان سے اس کے تمام منصوبے خواب پریشاں ہورہے ہیں تو وہ تلملا اٹھا۔ لیکن ہمیں اس کا کوئی گلہ نہیں کوئی شکوہ نہیں کیونکہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

جس بات کا رونا ہے وہ اس سے الگ ہے۔ جس قیامت کا ماتم ہے وہ کچھ اور ہی ہے۔ ہندو نے جب دیکھا کہ پاکستان کا مطالبہ اسلام کے نام پر کیا جارہا ہے۔ تو انہوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ اس کی روک تھام کا اس کے سوا مؤثر طریقہ کوئی نہیں کہ خود اسلام کے نام پر اس کی مخالفت کی جائے۔ اس کے لئے انہوں نے نیشنلسٹ علماء کو آگے بڑھایا۔ مسلمانوں کو جو زخم غیروں کے ہاتھوں لگے تھے تکلیف تو ان کی بھی ہوتی تھی کیونکہ زخم آخر زخم ہے۔ لیکن قیامت تو اس وقت برپا ہوتی ہے جب یہ دکھائی دے کہ جس ہاتھ میں خنجر ہے وہ ہاتھ ایک مسلمان کا ہے۔ حضرت عمرؓ کو جب بحالتِ نماز زخمی کیا گیا تو انہوں نے سب سے پہلے یہی دریافت فرمایا تھا کہ حملہ آور کون ہے۔ اور انہیں جب معلوم ہوا کہ وہ مسلمان نہیں تو سجدہ شکر بجا لائے۔ کہ الحمدللہ میرا قاتل کوئی مسلمان نہیں۔ لہٰذا، جب یہ دیکھا جائے کہ ملت کی رگِ جان پر جو خنجر رکھا جارہا ہے وہ خنجر ایک مسلمان کے ہاتھ میں ہے تو اندازہ فرمائیے کہ یہ منظر کس درجہ کرب انگیز اور یہ حادثہ کیسا جانکاہ ہوگا۔ اور پھر یہ ننگ اسلام ''مسلمان'' اس مخالفت میں چاروں طرف سے اس طرح یورش کر کے امنڈے گویا کسی نے بھڑوں کے چھتے میں پتھر دے مارا ہو۔ اور قیامت بالائے قیامت یہ کہ اس لشکر بلا انگیز کا مقدمہ الجیش ان حضرات پر مشتمل ہے جو بڑے بڑے جبوں اور عماموں سے آراستہ، طویل وعریض عباؤں اور قباؤں سے مزین پشت پر کتابوں کا طومار اٹھائے، بغلوں میں قرآن نہیں بلکہ جزدان دبائے بقائے دین اور حفاظت اسلام کے نعرے لگاتے ان ''ملحد و بے دین افراد'' کے تعاقب میں بڑھے جا رہے ہیں جن کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آزاد اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وہ قالب ہیں جنہیں جعفر اور صادق کی روحیں تلاش کر کے اپنا نشیمن بنالیتی ہیں۔ یہی وہ طائفہ ہے جس نے اپنے زہد و تقدس اور علم و فضل کی نظر فریب قباؤں میں خنجر و سنان چھپا رکھے ہیں کہ ملتِ اسلامیہ کا پرنور سینہ جن سے ہمیشہ چھلنی ہوتا رہا ہے۔

یہ علماء نہایت شد و مد کے ساتھ مطالبہ پاکستان کے مخالفین کی صف میں شامل ہوگئے۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں مل کر ایک وطن کے باشندے ہونے کی بنیاد پر ایک قوم کے افراد ہیں اور یہ تصور باطل ہے کہ اسلام کو ایک زندہ

حقیقت بننے کے لئے آزاد خطہ زمین کی ضرورت ہے' جس میں حکومت قوانینِ خداوندی کے مطابق قائم ہو۔ وہ کہتے تھے کہ سیکولر انداز کی جمہوری حکومت جس میں غیر مسلم (ہندو) اکثریت قانون وضع کرے' عین مطابقِ اسلام ہے۔ بس اتنا ضروری ہے کہ مسلمانوں کا پرسنل لاء (شخصی قانون یعنی نکاح طلاق وغیرہ) سے متعلق معاملات علماء کرام کے ہاتھ میں رہیں۔ ان علماء کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اگر مسلمان اس طرح ایک گوشہ زمین میں سمٹ کر بیٹھ گئے تو اسلام کی اشاعت رک جائے گی۔ اور یوں یہ اہم فریضہ خداوندی ساقط ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ وہ کہتے تھے کہ تقسیم ہند کی اسکیم کی رو سے ہندوستان کے ان مسلمانوں کو جو ہندو صوبوں کی اکثریت مین رہتے ہیں' کسمپرسی کی حالت میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ ہندوستان کے طول وعرض میں ہماری ہزار ہا مساجد ہیں۔ اس اسکیم کے مطابق یہ تمام مساجد چھوڑنی پڑیں گی۔ اقتصادی نقطۂ نظر سے بھی یہ اسکیم ناقابلِ عمل ہے۔ بلوچستان اور سندھ اپنا خرچ پورا نہیں کر سکتے۔ اس لئے انہیں مرکزی حکومت سے امداد ملتی ہے۔ اگر یہ خطہ الگ ہو گیا تو انہیں امداد کہاں سے ملے گی۔ پنجاب میں استطاعت کہاں ہوگی جو ان کی بھی کفالت کر سکے۔ نیز سرحد کی حفاظت کے سلسلے میں جو اخراجات آج مرکزی حکومت برداشت کر رہی ہے وہ بھی اس خطہ کو اٹھانے پڑیں گے۔ اور یہ کہ ہندوستان کے مستقبل کے انداز حکومت میں بہت کم اختیارات رہ جائیں گے۔ مختلف صوبے اپنے اندرونی معاملات میں بالکل آزاد ہوں گے۔ لہٰذا' جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں انہیں وہاں ہر طرح کا کامل اختیار و اقتدار حاصل ہوگا۔ پھر ایک نئے مرکز کی ضرورت کیا؟

ان خیالات کی حمایت کرتے ہوئے مولانا حسین احمد مدنی نے فرمایا تھا ''ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو' مسلم' سکھ' عیسائی' پارسی سب شامل ہوں۔ حاصل کرنے کیلئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے''۔ (اخبار زمزم مورخہ ۷ جولائی ۱۹۳۸ء) ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں۔ ''جو لوگ مسلمانوں کو اس میدان سیاست میں اترنے سے روک رہے ہیں اور متحدہ قومیت کی بھیانک صورتیں ظاہر کر کے نفرت دلا رہے ہیں۔ بلا شک وشبہ برطانیہ کی ایسی عظیم الشان خدمات انجام دے رہے ہیں جو اس کی افواج اور اسلحہ سے بھی انجام نہیں پا سکتیں۔ (متحدہ قومیت اور اسلام ص۔ ۷۰) اسی کتاب میں ہندوستانیوں کیلئے اپنے ضائع شدہ حقوق حاصل کرنے کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ ''ایسے مقاصد کیلئے متحدہ قومیت غیر مسلموں کے ساتھ بنانا خود جناب سرورِ کائنات ﷺ سے منقول ہے'' اس باب میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ارشادات بھی کچھ کم زہر آلود نہ تھے۔ کانگرس کے اجلاس بمقام راج گڑھ کی تقریب میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے فرمایا ''لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں۔ جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری راہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا عنصر ہوں' جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین کا ایک ناگزیر عامل ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا''۔ اس خطبہ میں تھوڑا آگے چل کر متحدہ قومیت کو قدرت کا اٹل فیصلہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ''ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا ہے۔ اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی ہے۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں۔ مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضا مند ہونا چاہیئے۔ اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیئے''۔

نیشنلسٹ علماء کے ساتھ احرار' سرحد کے خدائی خدمتگار' آزاد انصار وغیرہ جماعتیں بھی تحریکِ پاکستان کے خلاف متحدہ محاذ میں شریک تھیں۔ لیکن کانگریس کے بے پناہ فنڈز کے باوجود انہیں کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اسلئے کہ پہلے علامہ اقبال اور ان کے بعد قائداعظمؒ نے اسلامی مملکت اور دو قومی نظریہ کے متعلق

اس شرح وبسط سے خیالات کو عام کیا تھا کہ متحدہ قومیت اور سیکولر جمہوری نظام مسلمانوں کو اپیل ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس مقام پر ہندوؤں اور ان کے ساتھ انگریزوں کو بھی سوچنا پڑا کہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت کیلئے متبادل انتظام کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کیلئے کوئی ایسا شخص ہی موزوں ہو سکتا تھا جس کا ماضی تو کانگرس کے ساتھ وابستہ ہو لیکن وہ نیشنلسٹ علماء کی صف میں شامل نہ ہو اور اپنے آپ کو اقبالؒ کے نظریات کے موئید کی حیثیت سے متعارف کروائے۔ جیسا کہ بعد کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کیلئے ان کی نگاہ انتخاب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب پر پڑی۔ مودودی صاحب چھوٹی عمر میں صحافت کے پیشہ سے منسلک ہو گئے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں جب خلافت اور ستیہ گرہ کی تحریک کا آغاز ہوا تو انہوں نے اس میں بھی حصہ لیا تھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے گاندھی جی کی سیرت پر بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کے بعد مودودی صاحب جبل پور کے ایک نیشنلسٹ اخبار (تاج) کے ایڈیٹر ہو گئے۔ جبل پور میں خلافت کی تحریک کا آغاز اور وہاں کے مسلمانوں کو کانگرس میں شریک کرنے کا کام کیا۔ ۱۹۲۴ء میں مودودی صاحب جمعیت علماء ہند کے اخبار ''الجمعیۃ'' سے وابستہ ہو گئے۔ یہ اخبار نیشنلسٹ علماء کا سب سے مشہور ترجمان تھا۔ ۱۹۲۹ء میں آپ حیدر آباد دکن چلے گئے اور وہاں ماہنامہ ترجمان القرآن کی ادارت کا فریضہ سنبھالا۔ وہاں یہ کانگریسی خیالات کی تبلیغ نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اس رسالے میں ایسے مضامین لکھنے شروع کئے۔ جن سے علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ نظریہ قومیت کی تائید ہوتی تھی۔ اس زمانے میں ابھی طلوعِ اسلام کا اجراء عمل میں نہیں آیا تھا۔ اس لئے اگر کسی گوشے سے بھی اسلامی نظریہ قومیت کی تائید ہوتی تھی تو تحریکِ پاکستان کے حلقوں میں وہ آواز بڑی مقبول ہو جایا کرتی تھی۔ اس طرح ''اقبالی حلقے'' میں مودودی صاحب فکری طور پر متعارف ہوئے۔

اس زمانے میں مودودی صاحب نے مطالبہ پاکستان کی بھرپور حمایت کی اور اپنی تحریر و تقریر میں ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ''ہندوستان میں بسنے والے مسلمان اپنے مذہب کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی اس حیثیت کو برقرار رکھنا اور مستحکم کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ اس خطہ زمین میں مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت قائم ہو۔ کیونکہ آزادی کا اصل جوہر حکومت خود اختیاری سے متمتع ہونا ہے اور اپنی اجتماعی خواہشات اور ضروریات کو پورا کرنے پر آپ قادر ہونا ہے''۔ (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ دوم ص۔۳۲) آپ غور کیجئے کہ جو شخص اس زمانے میں مسلسل دو برس تک اس قسم کے مضامین لکھتا چلا جائے اسے مسلمانوں میں کس طرح مقبولیت حاصل نہ ہو جاتی' اور کون اس سے دھوکہ نہ کھا سکتا؟ مودودی صاحب نے اس طرح مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب تحریکِ پاکستان اور ہندوستان کی وطنی تحریک کی جنگ انتہائی شدت پر پہنچ رہی تھی۔ مسلمان قائداعظمؒ کی زیرِ قیادت ایک مستحکم قوم کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ انہوں نے پاکستان کا مطالبہ بھی متعین طور پر پیش کر دیا تھا۔ جس کا مظاہرہ مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ مارچ ۱۹۴۰ء میں ببانگِ دہل ہو چکا تھا۔ قوم اس مطالبے کو لے کر پوری یک جہتی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ نیشنلسٹ علماء اور دوسرے کانگریسی مسلمان لیڈروں کو کوئی پوچھتا تک نہیں تھا کہ عین اس وقت مودودی صاحب نے پلٹا کھایا اور یوں کہیئے کہ اپنے اصلی چہرے کے ساتھ سامنے آ گئے۔ انہوں نے اب ایک اور سلسلہ مضامین شروع کیا جو ان کے ماہنامہ ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۴۱ء اور مارچ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئے اور بعد میں جنہیں ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوئم'' کی صورت میں شائع کیا گیا۔

واضح رہے کہ تحریکِ پاکستان کی جنگ میں مسلمانوں کے پاس مخالفین کے مقابلے کیلئے دو ہی ہتھیار تھے۔ ایک یہ کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے جس کے سربراہ قائدِ اعظم محمد علی جناح ہیں اور دوسرا یہ کہ مطالبہ پاکستان ہمارے دین کا تقاضا ہے۔ یہ خالص اسلامی تحریک ہے۔ یہی وہ دو ہتھیار تھے جن سے مسلمان زعماء تمام مخالفین کو شکست پر شکست دیتے آگے بڑھتے جا رہے تھے کہ عین اس زمانے میں مودودی صاحب نے اس شہرت و مقبولیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جو انہوں نے پاکستانی روپ میں پہلے حاصل کر لی تھی۔ اس تحریک کی مخالفت شروع کی اور بظاہر بڑے ہی مقدس انداز میں شروع کی۔ مسلم لیگ یا قائداعظمؒ کا یہ دعویٰ تھا کہ حصول پاکستان ہندوستان میں بسنے والی قوم کا مطالبہ ہے۔ اس مسلمان قوم کے متعلق مودودی

صاحب نے لکھا:-

''یہ انبوہ عظیم، جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں اور نہ حق و باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کے اخلاقی نقطہ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے، اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر قبول کیا ہے اور نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔ ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں، حقیقی معنوں میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ ان کے اجتماع سے جو کام ہوگا اسلامی اصول ہی پر ہوگا۔ پہلی اور بنیادی غلطی ہے''۔

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوئم)

یہ تو رہا ان مسلمانوں کے متعلق، جن کی اکثریت کی بنا پر مطالبہ پاکستان پیش کیا جاتا تھا۔ اب آیئے ان کی قیادت کی طرف جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ اس وقت کی سیاسی جنگ میں مسلمان زعماء کا مؤثر ترین ہتھیار یہ تھا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور قائداعظم اس کے واحد نمائندہ سربراہ، جو اسلام کے تقاضا کی رو سے جداگانہ مملکت کا مطالبہ پیش کر رہے ہیں۔ اس قیادت کے متعلق مودودی صاحب نے کیا کیا زہر بکھیرا۔ اسے غور سے سنیئے۔ انہوں نے کہا:-

''افسوس کہ لیگ کے قائدِ اعظم سے لیکر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو''۔ (جلد سوم۔ص۔۳۷) ''ایسے لوگوں کو محض اس لئے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرزِ تنظیم کے استادِ فن ہیں اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں، سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے۔ (جلد سوئم۔ص۔۷۰) ان لوگوں کی عملی زندگی اور ان کے خیالات، نظریات، طرز سیاست اور رنگ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔ (جلد سوئم۔ص۔۴۷) ان میں اکثر کے گھروں میں آپ جایئے تو آپ کو نماز کے وقت کوئی یہ بتانے والا نہ ملے گا کہ سمتِ کعبہ کدھر ہے؟ اور اسباب عیش وعشرت سے بھری ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جانماز بھی فراہم نہ ہو سکے گی۔ سارے لیڈروں کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق امتحان لیجئے تو شائد ہی کوئی صاحب دو فی صدی سے زیادہ نمبر لے سکیں''۔

(جلد سوئم۔ص۔۷۷)

مودودی صاحب، جمہور مسلمانوں میں کیڑے ڈالنے کے بعد، ان کی قیادت کے پیچھے پڑے اور اس میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انہیں کہہ دیا کہ تمہیں اسلام کا نام استعمال کرنے کا بھی حق نہیں۔ لکھتے ہیں:-

''اگر یہ آپ کی قومیت ہے اور یہ آپ کا کلچر ہے اور یہ آپ کے قومی مقاصد ہیں تو آپ اپنی قوم کا جو نام چاہیں تجویز فرمالیں، اسلام کا نام استعمال کرنے کا آپ کو حق نہیں۔۔۔ اس نام کو بدل دینے کی ضرورت صرف اسلئے نہیں کہ آپ کے یہ نظریات جن پر آپ اپنی قومیت کی بنا رکھ رہے ہیں، اولاً اسلام کے خلاف ہیں، بلکہ اس کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ ان نظریات کے ساتھ آپ جو کچھ کریں گے وہ اسلام کیلئے رسوائی اور بدنامی کا موجب ہوگا۔۔۔ جو کچھ یہ لوگ کرنا چاہتے ہیں، شوق سے کریں، ہم ان کا راستہ روکنے نہیں آتے، ہمارا مطالبہ ان سے صرف یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمان کے نام کو غلط طریقہ پر استعمال کرنا چھوڑ دیں''۔

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوئم)

قارئینِ کرام! یہ تھے وہ دل شکن حالات جن میں حصولِ پاکستان کی جنگ لڑی جارہی تھی۔ ہم نے مخالفت کی صرف جھلکیاں دکھائی ہیں۔ اور جو کردار اس محاذ جنگ کی کمان سنبھالے ہوئے تھے ان کی منافقانہ روش اور بغض وعناد سے لبریز ذہنیت کی معمولی سی عکاسی کی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس جنگ میں غیر مسلم تو مسلمانوں سے صرف آزادی کا حق چھین رہے تھے لیکن خود

مسلمان علماء مطالبہ پاکستان کی مخالفت میں اس درجہ متشدد ہو گئے کہ وہ پاکستان کے حامیوں کو مسلمان کہلانے کا حق بھی نہیں دینا چاہتے تھے۔ جب نیشنلسٹ علماء کی طرف سے مطالبہ پاکستان کی مخالفت شدت تک پہنچ گئی تو ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی ایسا آرگن (Organ) ہو جو ان کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب خدا اور رسولؐ کے ارشادات کی روشنی میں دے۔ مسلمانانِ ہند کی جنگِ آزادی کی قیادت قائداعظمؒ جیسا دیدہ ور سپہ سالار کر رہا تھا۔ قوم کی اس رزم موت و حیات میں حضرت قائداعظمؒ نے جس مشاقی اور حسن تدبر سے رہبری کی اس کے نتیجہ میں قوم کا سفینہ حیات سطح آب پر ایک حسین بط کی طرح تیرتا ہوا ساحلِ امید پر آلگا۔ قائداعظمؒ نے چومکھی لڑائی لڑی اور ہر مخالف کو زیر کیا۔ آپ کے ترکش میں ہر طرح کا تیر تھا لیکن مذہب کی بنیاد پر جو مخالفت کی جا رہی تھی وہ آپ کے دائرہ عمل سے باہر تھی۔ اس کیلئے انہیں ایک ایسے دیدہ و بینا صاحب ادراک کی ضرورت پیش آئی جو قرآن و سنت پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ مطالبہ پاکستان کا حامی اور دوقومی نظریئے کا مخلص اور وفادار بھی ہو۔ بانی طلوعِ اسلام محترم غلام احمد پرویز ان دنوں مرکزی سیکریٹریٹ میں کام کرتے تھے۔ لیکن فکرِ اقبال کا شیدائی اور مبلغ ہونے کی بنا پر ''اقبالی حلقے'' میں معروف مقام رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ تحریکِ پاکستان کیلئے آپ کی مساعی جمیلہ کو قائداعظم بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ کے ایماء پر پرویز علیہ الرحمتہ نے مذہبی محاذ کو سنبھالا اور جس طرح اپنے قائد کو انگریز اور ہندو سے نبٹنے کی فرصت مہیا کی، اس پر ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۲ء کے ماہ نامہ طلوعِ اسلام کے فائل شاہد ہیں۔ جس کا اجراء اسی مقصد کے حصول کیلئے کیا گیا تھا۔

تحریکِ طلوعِ اسلام کے اس شاندار کردار کا ذکر اگر ہم شروع میں کر دیتے تو شائد آپ بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکتے۔ اسی لئے ہم نے تحریکِ پاکستان کی سرگزشت کے چیدہ چیدہ واقعات اور ان سے وابستہ کرداروں کا مختصر تعارف پیش کیا تاکہ آپ وثوق کے ساتھ طلوعِ اسلام کے کردار کو سمجھنے کیلئے ان فائلوں کا مطالعہ کر سکیں اور ان چہروں کو پہچان سکیں جو آج بھی دین کے مقدس لبادوں میں سادہ لوح مسلمانوں کو اسلامی نظام کا دھوکہ دے رہے ہیں۔ یاد رکھیئے! آج بھی ان لوگوں کے سامنے دین کا صحیح تصور نہیں۔ یہ اسلام کو مذہب سمجھتے ہیں اور مذہب کی بنیاد پر کوئی بھی ریاستی نظام تشکیل نہیں دیا جا سکتا۔ دین کا صحیح تصور، پہلے کی طرح، صرف طلوعِ اسلام پیش کرتا ہے۔ اگر آپ پاکستان میں اسلامی نظام صحیح خطوط پر قائم کرنا چاہتے ہیں تو صرف طلوعِ اسلام کا مطالعہ کیجئے۔ حصولِ پاکستان کی کامیابی طلوعِ اسلام کی صداقت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس وقت اگر طلوعِ اسلام میدان میں نہ آتا تو یہ مذہبی پیشواء بانیانِ پاکستان کی جدوجہد پر اسی طرح پانی پھیر دیتے جس طرح سامری نے موسیٰؑ کی سالہا سال کی محنت کے پھل کو ایک پل میں اچک لیا تھا۔ موسیٰؑ بڑی مشقتوں کے بعد اور جان جوکھوں میں ڈال کر بنی اسرائیل کو فرعونی استبداد سے چھڑا کر لائے تھے۔ لیکن سامری نے ایک بچھڑا بنایا اور پوری قوم کو اپنی راہ پر ڈال لیا۔ موسیٰؑ سر پیٹ کر رہ گئے۔ یہی حال مولویوں نے قائداعظم کا کرنا تھا۔ لیکن عین وقت پر طلوعِ اسلام سامنے آیا اور ان کے ہر وار سے اپنے محبوب قائد کو بچا لیا۔ طلوعِ اسلام کے سامنے آج بھی وہی مقاصد ہیں اور یہ نہایت تندہی سے ان کے حصول کیلئے کوشاں ہے۔ جب تک قرآنی نظام قائم نہیں ہو جاتا ہماری ذمہ داریاں ختم نہیں ہو سکتیں۔ ہم نے اپنے خدا کے ساتھ میثاق باندھ رکھا ہے کہ جب تک اس کا نظام غالب نہیں آجاتا ہم چین کی نیند نہیں سوئیں گے۔ اور اس کے قیام کیلئے شبانہ روز بھرپور جدوجہد کرتے رہیں گے۔ انشاءاللہ۔

(بشیر احمد عابد، کویت)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بدبخت یہودی بن زاک کی دریدہ دہنی

گذشتہ دنوں پشاور کے ایک انگریزی معاصر روزنامے ''فرنٹیئر پوسٹ'' میں ''مدیر کے نام خطوط'' کے کالم میں بن زاک (Bendzac) نامی کسی بدبخت یہودی کا ایک ای میل مراسلہ شائع ہوا۔ مراسلہ نگار نے قرآن کریم اور پیغمبر آخر حضرت محمد ﷺ **(فداہ امی وابی)** کی شان اقدس میں جس ذہنی افلاس، نفسیاتی ژولیدگی اور تیرہ باطنی کا نفرت انگیز اظہار کیا اس پر بجا طور پر پاکستان بھر میں شدید احتجاج کیا گیا۔ یوں تو متعصب اور اخلاقی و ذہنی پس ماندگی کے شکار غیر مسلم قبل ازیں بھی اپنے خبث باطن کا مظاہرہ کرنے پر مسلمانوں کی نفرت کا شکار بنتے رہے ہیں تاہم یہودیوں کی اسلام دشمنی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔

یہودی از روئے قرآن اللہ کی ناشکری قوم ہے۔ یہ امت کبھی اس زمین پر اللہ کی نمائندہ امت تھی اور اللہ نے بے شمار اور ان گنت نعمتوں سے اسے نوازا تھا۔

یبنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم وانی فضلتکم علی العالمین ○ (۲/۴۷ نیز ۲/۱۲۲ اور ۱۰/۹۳)

اس پر ذلت وخواری، بے کسی وبسی، نکبت وادبار اور ذل ومسکنت کا عذاب ان کے اپنے جرائم کی پاداش میں مسلط ہوا۔ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ان جرائم کا ذکر آیا ہے جو حضرت موسیٰؑ کے زمانہ سے عہد رسالت مآب تک ان سے سرزد ہوتے چلے آرہے تھے۔ ان جرائم کی فہرست طویل ہے لیکن اصل جرم صرف ایک ہی ہے یعنی قوانین الٰہیہ سے سرتابی۔ باقی سب اسی اصل کی شاخیں یا اسی اجمال کی تفصیل ہیں (القرآن ۴۳/۵)۔

پیغام خداوندی کا اتباع تو کجا ان کی قساوت قلبی کی یہ کیفیت ہو چکی تھی کہ یہ انبیاء تک کو قتل کر دیا کرتے تھے (دیکھئے ۲/۸۷، ۵/۷، ۴/۱۵۵) یہود کے قتل انبیاء کا ذکر بائبل کے کئی ایک مقامات میں آیا ہے۔ حضرت مسیحؑ نے ان کی تباہی وبربادی کا بہت بڑا سبب اسی جرم عظیم کو قرار دیا ہے (متی ۲۹۔۳۷/۲۳)۔

نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور چونکہ یہود کی خواہشات کے برعکس بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسماعیل میں ہو گیا تو انہوں نے حسد اور تکبر کے باعث جان بوجھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا۔ انہیں معاذ اللہ قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جنگ خندق میں عین موقعہ پر عہد شکنی کر کے مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی کوشش کی۔ آپؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد مسلمانوں میں فساد پھیلانے اور تفرقہ سازی کے لئے جو کچھ کیا اس کے ذکر سے تو صدہا ضخیم کتابیں بھری پڑی ہیں۔ اسلام کے دیگر مخالفین کی طرح یہودیوں نے بھی اپنی ہر منفی حرکت کا نتیجہ عالمی تنفر کی صورت میں پایا ہے۔ اکیسویں صدی کا انسان تہذیب، علم اور انسانی حقوق کے اعتبار سے اعلیٰ ترین رفعتوں تک رسائی پا چکا ہے لیکن یہودی ہیں کہ روز اول کی طرح آج بھی اپنے نفس کی کثافت سے چھٹکارا نہیں پا سکے مذکورہ ای میل مراسلہ ایک یہودی نہیں بلکہ پوری کی پوری یہودی قوم کے اجتماعی شعور کی آواز ہے۔ وہ شعور جو اسلام دشمنی میں انسانیت کی ارزل ترین سطح تک گرا ہوا ہے۔ دریدہ دہن یہودی مراسلہ نگار نے حضرت محمد ﷺ کی ذات اقدس پر ایک مسلمان مورخ کے حوالے سے انگشت نمائی کی ہے اور۔۔ نقل کفر کفر نباشد۔۔ معاذ اللہ۔ معاذ اللہ انہیں ''پہلا نازی'' قرار دیا ہے۔ یہودی مراسلہ نگار کا ضمیر زندہ ہوتا تو وہ فلسطینیوں پر اس کے مظالم کی مذمت کرتا جس پر نہ صرف مسلمان بلکہ ساری مہذب دنیا سراپا احتجاج بنی ہوئی ہے۔ روزانہ بیسیوں نہتے، معصوم فلسطینی بچے اور نوجوان قتل کئے جا رہے ہیں، گھروں پر بمباری ہو رہی ہے، ہسپتالوں تک کو یہودی شقاوت نے محفوظ نہیں چھوڑا۔ کیا یہ سب ظلم وستم نازی ازم نہیں؟ کیا یہ حیوانیت نہیں؟ کیا یہ دہشت گردی نہیں؟ کیا یہ انسانیت کے خلاف ناقابل معافی جرم نہیں؟ حالیہ انتخابات میں ایریئل شیرون جیسے شقی القلب، متعصب اور جنگی جنون میں مبتلا شخص کا وزیر اعظم منتخب ہونا اسرائیلی یہودیوں کے تشدد پسندانہ اور وحشت انگیز اسلام دشمن اجتماعی شعور کا آئینہ دار ہے اور مذکورہ مراسلہ نگار بھی اسی دہشت گرد، انسان دشمن قوم کا ایک فرد ہے۔۔ گویا اسرائیلی یہودی قوم کا ہر ہر فرد مسلمانوں سے نفرت کا مجسمہ ہے، زہر سے معمور ہے۔ اسی نفرت کی وجہ سے ان کے ذہن مسموم ہو چکے ہیں اور فکر ژولیدہ ہے۔

اے کاش! ایسا ہوتا کہ مراسلہ کی اشاعت کے فوراً بعد سرکاری مشینری حرکت میں آجاتی اور خط نویس اور اس کی اشاعت کے ذمہ دار اہلکاروں کو حراست میں لے لیا جاتا اور اخبار کی انتظامیہ کی طرف سے پہلے صفحہ کی شہ سرخی میں اس غفلت پر معذرت اور ندامت کا اظہار کیا جاتا اور یہ پیش کش کی جاتی کہ اس غفلت کے مرتکب افراد کے خلاف کیس میں اخبار کی انتظامیہ خود فریق بنے گی اور انہیں قانون کے مطابق قرار واقعی سزا دلوانے کی بھرپور کوشش کرے گی (اگرچہ دوسرے ہی روز مذکورہ اخبار کی انتظامیہ کی طرف سے دیگر بڑے اخبارات کے پہلے صفحے پر امت مسلمہ سے بلا مشروط معافی نامہ چھپ گیا تھا)۔ اس طرح یقیناً ملکی، حکومتی اثاثوں اور نجی املاک کو کوئی نقصان نہ پہنچتا اور امن وامان کا مسئلہ بھی پیدا نہ ہوتا۔ لیکن۔۔۔۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

(محمد سلیم اختر)

پمفلٹس -- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے۔

مندرجہ ذیل پمفلٹس ۳ روپے فی پمفلٹ کے حساب سے ڈاک ٹکٹ بھجوا کر طلب فرمائیں۔

1- آرٹ اور اسلام
2- .....
3- اسلام کیا ہے؟
4- .....
5- اسلام آگے کیوں نہ چلا؟
6- .....
7- اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟
8- .....
9- اندھے کی لکڑی
10- بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
11- جہاں مارکس ناکام رہ گیا
12- حرام کی کمائی
13- .....
14- .....
15- دو قومی نظریہ
16- روٹی کا مسئلہ
17- .....
18- .....
19- .....
20- عورت قرآن کے آئینے میں
21- فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں؟
22- قرآن کا سیاسی نظام
23- قرآن کا معاشی نظام
24- قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر
25- کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
26- کافرگری
27- .....
28- مقام اقبالؒ
29- مرزائیت اور طلوع اسلام
30- مقام محمدی ﷺ
31- ماؤزے تنگ اور قرآن
32- ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟
33- ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
34- Islamic Ideology
35- Is Islam a Failure?
36- Why Islam is the Only True Deen?
37- Parmanent Values
38- اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟
39- انسانیت کا آخری سہارا
40- پاکستان کی نئی "زیارت گاہیں"
41- نماز کی اہمیت
42- ہم عید کیوں مناتے ہیں؟
43- Why Do We Lack Character?
44- ہندو کیا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لے گئے تثلیث کے فرزند، میراثِ خلیلؑ

محشرستان فلسطین

(نوشتہ 1967ء)

(اسرائیلی حکومت مئی ۱۹۴۸ء میں وجود میں آئی تھی اور ''طلوع اسلام'' جون ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا تھا جس میں اس کش مکش کے پس منظر کو پوری صراحت کے ساتھ واضح کیا گیا تھا۔ حالات آگے بڑھتے گئے تو ''طلوع اسلام'' کی اشاعت بابت فروری ۱۹۶۷ء میں اسے دھرایا گیا۔ اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً اس المیہ جانگداز و جگرسوز کے متعلق لکھا جاتا رہا۔ اب جو اس مسئلہ نے خاص اہمیت حاصل کی ہے تو ہم سے کہا جا رہا ہے کہ اس قضیہ ماضی کو سامنے لایا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس مفسدہ انگیزی اور خونریزی کی اصل کیا ہے۔ اس بناء پر ہم نے مناسب سمجھا کہ اس کی ابتداء اس تشریحی مقالہ سے کی جائے جو ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا اور جو بڑا معلومات افزا تھا۔ اس ماضی کی داستان سے حال کی حشر انگیزی کے سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔)

اہل فلسطین، خواہ وہ کسی نسل سے متعلق کیوں نہ رہے ہوں، آغاز تاریخ سے ہی جنگوں سے دوچار رہے ہیں۔ انسانی تاریخ کوئی زیادہ طویل نہیں، بمشکل چھ سات ہزار سال کا ریکارڈ موجود ہوگا۔ تاریخ کی روشنی وقت کے اندھیرے کو اور روشن کر سکے تو فلسطین جنگ و پیکار میں ہی الجھا دکھائی دے گا۔ جغرافیہ نے اس ملک کو، کہ جس کا رقبہ بمشکل پنجاب کے چار اور سندھ کے دو اضلاع کے برابر ہوگا، کچھ ایسا مقام بخشا ہے کہ یہ حقیر سا ملک کبھی امن و اطمینان سے نہ رہ سکا۔ نقشہ عالم پر نگاہ ڈالنے سے یہ روشن ہو جائے گا کہ ایسا ہونا ناگزیر تھا۔

بین الاقوامی جنگاہ

منضبط تاریخ کے آغاز سے ہی فلسطین معلوم دنیا کا مرکز تھا۔ اس کے مشرق میں ایشیا تھا، مغرب میں یورپ، شمال میں پھر یورپ اور ایشیا، جنوب میں افریقہ۔ یہ ساری کی ساری معلوم دنیا تھی۔ امریکہ، آسٹریلیا اور شمالی ساحل کے علاوہ سارا افریقہ غیر مساحت شدہ اور غیر معلوم تھا۔ شمالی اور جنوبی امریکاؤں اور آسٹریلیا ایسے وسیع و عریض ارضی حصص کی موجودگی کا گمان تک بھی نہ تھا۔ نقشہ پر یورپ تھا اور وہ بھی جنوبی اور مشرقی، شمالی افریقہ مشمولہ مصر اور ایشیا۔ اس معلوم دنیا کے عین وسط میں ایک معمولی حصہ زمین، انگلستان کے علاقہ ویلز کے برابر فلسطین۔ معلوم دنیا میں قومیں ابھرتی اور مٹتی رہیں۔ چین، وادی سندھ، سیریا، بابل، مصر، فارس، یونان، روما! ان اقوام کے عروج و زوال کے لئے باہمی تصادم ناگزیر تھا۔ ان بین الاقوامی معرکوں کے طوفان اس حقیر سے زمینی ٹکڑے کو بے دردی سے روند ڈالتے رہے۔ اس کے حیات و مطالبات دھرے کے دھرے رہ جاتے اور اس کے باشندے کچل دیئے جاتے۔ فلسطین کے سامنے ہمیشہ یہ سوال رہا کہ وہ اس کا حلیف

ہو یا اس کا حریف، وہ کس کی مدد کرے اور کس سے استمداد۔ اس کا فیصلہ اور انتخاب کچھ بھی ہو، نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔

امن کے زمانہ میں فلسطین، بین الاقوامی، تجارتی قافلوں کی گزرگاہ تھا اور جنگ کے زمانہ میں عساکر و جیوش کی آماجگاہ۔ فلسطین بری اور بحری شاہراہوں پر تھا۔ یورپ۔ ایشیا اور افریقہ فلسطین کے ذریعہ باہمی تجارت کرتے تھے۔ امن کی حالت میں فلسطین فارغ البال رہتا اور جنگ کے دوران میں وہ تباہ ہو جاتا۔ اس کی قومی آزادی و خودمختاری ناقابل حصول ہی رہی۔ ایسے مواقع پر کہ متحارب فریق برابر قوت کے مالک ہوتے تو فلسطین کسی ایک طرف ہو کر پانسہ پلٹ دیتا تھا۔ اس وقت اہل فلسطین کی حقیر امداد بھی متعلقہ فریق کا پلڑا بھاری کر دیتی۔ لیکن یہ اہمیت خطرناک تھی۔ وہ حریف یا حلیف بن کر آسان جنگاہ بن جاتا رہا۔

آل اسرائیل

حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل (مرد خدا) تھا۔ آپ کی اولاد سے جو نسل آگے بڑھی، اسے بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ کے چوتھے بیٹے کا نام یہودہ (Juda) تھا۔ یہودہ اور بن یامین کی نسل کا قبیلہ فلسطین کے علاقہ موسومہ (Juda) میں سلطنت کرتا تھا۔ اسی نسبت سے انہیں یہودی کہا جانے لگا اور باقی قبائل کو بنی اسرائیل..... آہستہ آہستہ یہ تفریق بھی جاتی رہی۔ چنانچہ اب بنی اسرائیل اور یہودی کا ایک ہی مفہوم لیا جاتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا وطن کنعان (فلسطین) تھا۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے اپنے والد بزرگوار اور تمام قبیلہ کو مصر بلا لیا تھا۔ حضرت یوسفؑ کی وجہ سے ان کی مصر میں بڑی تعظیم و تکریم ہوئی۔ چار سو برس تک یہ مصر میں رہے۔ یہیں بڑھے، پھولے، پھلے۔ جو قبیلہ چند نفوس پر مشتمل تھا، اس عرصہ میں عظیم الشان قوم بن گیا۔ فرعون مصر ان کی بڑھتی ہوئی قوت و کثرت سے خائف ہوا کہ مبادا وہ اس کے دشمنوں سے مل کر کوئی سازش برپا کر دیں۔ اس لئے اس نے انہیں کچلنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ یہ حکم دے دیا گیا کہ ''بنی اسرائیل کی قوت کی روک تھام کے لئے ان کے بیٹوں کو ہلاک کر دیا جائے اور بیٹیاں زندہ رہنے دی جائیں''۔ یعنی ان میں کے ایسے لوگوں کو جن میں جوہر مردانگی کی نمود ہو، کچل دیا جائے، اور زنانہ صفت لوگوں کو آگے بڑھایا جائے۔

حضرت موسیٰؑ، کہ آل اسرائیل کے اولوالعزم پیغمبر ہیں، اسی عالم میں مصر کے دارالسلطنت میں پیدا ہوئے۔ مشیت ایزدی نے آل اسرائیل کے اس فرزند کی پرورش کا سامان شاہی محلات میں کر دیا اور اس کے بعد طور کی وادیوں میں آزاد تربیت کا انتظام۔ وہاں سے لوٹ کر انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو ملک چھوڑ دینے کی اجازت دی جائے۔ یہودیوں کی اپنی روایات (عہد نامہ عتیق) کے مطابق حضرت موسیٰؑ کے بعد جوشوا کی قیادت میں بنی اسرائیل نے فلسطین کو بزور شمشیر فتح کیا اور قدیم باشندوں کو ملک بدر کر دیا یا ان کا خاتمہ کر دیا۔ جدید مورخین اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ قدیمی باشندے بالکلیہ نیست و نابود ہو گئے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ کبھی بھی مکمل طور پر فتح نہیں ہو سکے۔ بلکہ مفتوحہ علاقہ میں آباد رہے اور بنی اسرائیل سے ازدواجی تعلقات قائم کر لئے۔ ایچ۔ جی۔ ویلز نے اپنی کتاب (The Outline of History) میں لکھا ہے:-

> یہ نہیں کہا جا سکتا کہ موعودہ سرزمین (The Promised Land) کبھی بھی مکمل طور پر عبرانیوں کے قبضہ میں رہی ہے۔ انجیل کی متفرق کتابوں میں باختلاف واقعات تاریخ کو دہرایا گیا ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ (Philistines) جنوب کی زرخیز زمین پر قابض رہے اور شمال میں کنعانی اور فونیشین اسرائیلیوں کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔

اسرائیلی، شبانی اور زرعی زندگی کے عادی تھے، مگر ان میں سپاہی بھی تھے۔ مفتوح (یا ہنوز غیر مفتوح) پر رحم کرنا، ان کے نزدیک یہودہ کے خلاف گناہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنے پیشرو

مالکان زمین کو ختم نہ کر دینا ادائے فرض میں ناکامی کے مرادف سمجھتے تھے۔ یہودیوں کی موجودہ خصائل۔۔۔شہروں میں بسنا' مالیات و تجارت میں مہارت وغیرہ۔۔ ان کے اسرائیلی اسلاف کی خصائل ہیں۔ان کی ابتدائی زندگی خونریزی کی تفسیر ہے۔ بعد میں وہ کاشتکار اور زراعت پیشہ رہے نہ کہ مدنی معمار۔حضرت سلیمانؑ کے تزک و احتشام کے باوجود عہد نامہ عتیق کی داستان' مکانات اور محلات کے بجائے گیہوں' انگور' زیتون' بھیڑوں اور بیلوں کی داستان ہے۔ خدا کے لئے ان کے ہاں عزیز ترین نام ''شبان'' (گڈریا) ہے۔

حضرت داؤد اور سلیمانؑ' آل اسرائیل کے جلیل القدر بادشاہ تھے اور پیغمبر بھی۔ حضرت داؤدؑ نے پہلی بار گیارہویں صدی قبل مسیح میں یروشلم کو اپنا پایہ تخت بنایا اور حضرت سلیمانؑ نے دسویں صدی میں بیت القدس کے پہلے ہیکل کی تعمیر کرائی۔ یہ زمانہ بنی اسرائیل کے اوج کمال کا زمانہ تھا۔حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں ان کی شوکت وثروت انتہائی عروج تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے بعد انحطاط کے آثار شروع ہو جاتے ہیں۔حضرت سلیمانؑ کے انتقال کے بعد بارہ اسرائیلی قبائل میں سے دس نے فلسطین کے شمالی حصہ میں ''سلطنت اسرائیل'' کو قائم کیا۔ باقی دو یعنی جوڈہ اور بن یامین کے قبائل بدستور جنوب میں تخت داؤد کے وفادار رہے۔

تباہی کی داستان

یوں تو یہود کی تباہی کی داستان کی ہر کڑی عبرت انگیز ہے لیکن ان پر دو مرتبہ ایسی ہلاکت آفریں بربادی کی لعنت طاری ہوئی جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے شاید اس سے قبل نہ دیکھی تھی۔ قرآن نے ان ہر دو مواقع کی طرف خصوصیت سے اشارہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ہر بربادی ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھی' بلا جرم سزا نہیں تھی۔

وقضینا الی بنی اسرائیل فی الکتب لتفسدن فی الارض مرتین ولتعلن علوا کبیرا۔ (۱۷/۴)۔

''اور (دیکھو) ہم نے کتاب (یعنی تورات) میں بنی اسرائیل کو اس فیصلہ کی خبر دے دی تھی کہ تم ضرور ملک میں دو مرتبہ خرابی پھیلاؤ گے اور بڑی ہی سخت درجہ کی سرکشی کرو گے''۔

تورات میں بھی بنی اسرائیل کی ان دو بڑی تباہیوں کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ کوئی ۷۲۱ ق۔م میں شمالی فلسطینی حکومت پر اشوریوں نے قبضہ کر لیا تھا اور باشندوں کو قید کر کے لے گئے تھے۔ تاریخ ان کے انجام کے متعلق بالکل خاموش ہے۔ اس حادثہ کے کوئی ایک سو سال بعد' بابل کے شاہ بخت نصر نے ''جنوبی حکومت'' کو تہ و بالا کر دیا۔ یروشلم کی' کہ یہودیوں کا دینی اور سیاسی مرکز تھا' اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یہ قتل و غارت گری سلب ونہب کا ایسا جاں گداز مرقع تھا جو تاریخ عالم مین ضرب المثل بن چکا ہے۔ اس سے نہ صرف بنی اسرائیل کی سلطنت تباہ ہوئی' بلکہ ان کی قومیت کا بھی شیرازہ بکھر گیا۔ ان کی مرکزیت فنا ہو گئی اور غلامی ومحکومی' ہلاکت و بربادی کی بڑی سے بڑی مصیبتیں جو کسی قوم پر آ سکتی ہیں سب یکجا ہو گئیں۔ بخت نصر نے یروشلم کو لوٹا' جلایا' یہودیوں کا قتل عام کیا اور بقیۃ السیف کو قید کر کے اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ یہ سانحہ ایسا المناک اور دل سوز تھا کہ بابل کی اسیری کے زمانہ میں یہودیوں کے انبیاءؑ ان کی اس زبوں حالی پر خون کے آنسو بہاتے تھے۔ اسارت کا یہ زمانہ شاہ فارس کے ہاتھوں ختم ہوا' جب ساٹھ سال کے بعد سائرس نے دریائے فرات اور بحر روم کا درمیانی علاقہ فتح کر لیا اور یہودیوں کو فلسطین واپس جانے کی اجازت دے دی۔ شاہ یا شاہان فارس نے یروشلم کی دوبارہ آبادی اور ہیکل کی از سر نو تعمیر کی بھی اجازت دے دی۔ چنانچہ ۵۳۷ سے ۵۱۵ ق۔م کے دوران ہیکل پھر تعمیر ہو گیا اور مردہ یہودی قوم نے پھر زندگی حاصل کی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہودیوں کی پھر سے وہی حالت ہو گئی اور وہ اسی نہج زندگی کی طرف لوٹ آئے جس کی پاداش میں ان کی پہلی بربادی ظہور میں آئی تھی۔ فارس کے زیر اقتدار یہودیوں نے جو تھوڑی بہت آزادی حاصل کی تھی' سکندر نے ۳۳۲ ق۔م

میں اس پر ضرب کاری لگائی اور فلسطین کی آزادی کا ملاً مسلوب کر لی۔ ۳۲۰ ق۔م میں بطلیموس (Ptolmy) نے مصر کے راستے حملہ کیا اور یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ یونانیوں (مصری بطلیموسوں) نے یہودیوں پر خوب مظالم کئے۔ حتیٰ کہ ۶۶ ق۔م میں اس دوسری اور آخری تباہی کی تمہید شروع ہو گئی' جن کا ذکر صحف یہود میں اور جن کے آثار ان کی پیشانیوں میں جھلک رہے تھے' پاپی (رومی) آگے بڑھا اور اس نے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اس تاخت و تاراج میں تقریباً بارہ ہزار یہودی تباہ ہو گئے۔ ۵۱ ق۔م کے قریب ایک اور یورش میں تیس ہزار یہودی غلام بنا لئے گئے اور ڈھور ڈنگر کی طرح فروخت ہوئے۔

فطرت کی طرف سے انہیں باز آفرینی کا ایک اور موقع دیا گیا اور ان میں حضرت عیسیٰؑ مبعوث ہوئے لیکن یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ایک دنیا پر روشن ہے۔ اس اتمام حجت کے بعد ان کی آخری بربادی کا وقت آ گیا۔ رومیوں نے ۷۰ء میں ایک ایسا وار کیا جس نے اس بدبخت قوم پر ابدی ہلاکت کی مہر ثبت کر دی۔ اس کے بعد یہ قوم دشت پیمائیوں اور صحرا نوردیوں میں ذلیل و خوار رہی۔ ''قبل مسیح'' بعد مسیح میں بدل گیا۔ لیکن یہودیوں کے مصائب میں کمی نہ ہوئی..... ۱۳۵ء میں شاہ ہیڈرین (Hadrian) نے یروشلم پر قبضہ کیا اور اسے مکمل طور پر غارت کر دیا اور یہودیوں کو فلسطین سے نکال کر چار دانگ عالم میں بکھیر دیا۔

آئندہ سال یروشلم میں

فلسطین سے نکل کر یہودی جس جس ملک میں گئے وہیں آباد ہو گئے' وہیں کے باشندے بن گئے۔ فلسطین میں ان کی تعداد بمنزلہ صفر کے رہی۔ ان میں سے بعض البتہ فلسطین کے خواب ضرور دیکھتے رہے اور وقتاً فوقتاً' قطرہ قطرہ' فرداً فرداً فلسطین میں واپس آتے گئے۔ ان کی مراجعت کی ایک حد تک وجہ یاد وطن' تھی اور ایک حد تک' یہ مذہبی آرزو اور عقیدہ کہ فلسطین خدائے یہودہ (Jehorah) نے ان کے لئے مقدر کر دیا ہے۔ ''دشمن'' کی فتوحات اور ''اپنی'' شکستیں ''تقدیر'' کے اس لکھے کو مٹا نہیں سکتیں۔ یہ آرزوئے ''وطن'' مذہبی عقیدہ سے مذہبی رسم میں بدل گئی۔ چنانچہ ہر سال (Passover) کی ضیافت میں یہ الفاظ دہرائے جاتے رہے کہ ''آئندہ سال یروشلم میں''۔

یہودی تاریخ ساز نہیں بلکہ تاریخ کی ساخت ہیں۔ انہوں نے تاریخ کو بنایا نہیں بلکہ وہ تاریخ سے بنے ہیں۔ جب صحراؤں کی خاک چھاننے کے بعد ارض مقدس و موعودہ میں داخل ہوئے ہیں تو تاریخ کے قابل ذکر ابواب ان کی آس پاس کی قوموں کے ہاتھوں لکھے جا چکے تھے۔ انہوں نے نہ کلچر کو ترقی دی' نہ تہذیب و تمدن میں ہی کچھ خاص اضافہ کیا۔ ان کی حکومت اور تشخص قومی کا دور مختصر اور نا قابل رشک تھا۔ جب بھی ان کے پاس کچھ دولت جمع ہو جاتی' اور فراغت کے آثار نمایاں ہونے لگتے' کوئی نہ کوئی غارت گر آ پہنچتا اور ان کو تباہ و برباد کر کے چلا جاتا۔ بخت نصر کے ہاتھوں جب ان کی تباہی ہوئی تو پھر تاریخ کا رہا سہا رشتہ بھی ان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ شاہ فارس سائرس نے ہر چند انہیں فلسطین واپس آنے کی اجازت دے دی لیکن چونکہ اسارت کا زمانہ ساٹھ سال کا ہو چکا تھا' اس لئے کم تعداد میں یہودی واپس آئے اور جو آئے وہ بھی اصلی یہودی نہیں تھے۔ ان کا تشخص مٹ چکا تھا اور ذلت و مسکنت کی لعنت ان پر مسلط ہو چکی تھی۔

زمان و مکان کے پاس یہودیوں کے ظلم و استبداد کے سوا کچھ نہیں۔ ہر ملک اور ہر زمانہ میں وہ دیگر اقوام کا تختہ مشق بنے رہے۔ جب عیسائیت کا دور دورہ شروع ہوا تو اس حقیقت کے باوجود کہ حضرت مسیحؑ یہودی تھے اور ان کے اولیں حواری بھی یہودی تھے' ان کو دشمنان مسیحیت سمجھ کر مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔ عیسائی سلطنت میں یہودیوں کے لئے چنگڑ خانے بنائے گئے۔ معاش کی راہیں ان کے لئے مسدود کر دی گئیں اور ان کے خلاف نفرت و حقارت پھیلانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ ان کے لئے سود خواری کے سوا کوئی راہ معاش نہیں تھی۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ انہیں طرح طرح

کی جسمانی اذیتیں پہنچائی گئیں اور بے دردی اور سفاکی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ پوپ پیئس پنجم کے ایک حکم سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں پرانے کپڑے بیچنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔ یہ قومی سزا ان کے ایک جرم کی پاداش میں تھی کہ وہ یہودی تھے۔

انقلاب فرانس نے عوام کا نظری مرتبہ بلند کیا اور خیالات ونظریات میں جو رواداری اور کشادہ نگہی پیدا کی وہ یہودیوں کے لئے مفید ثابت ہوئی۔ ۱۷۸۹ء یہودیان یورپ کے لئے ایک نئی صبح کا پیغام تھا۔ آئندہ سو سال میں روس کے سوا ہر جگہ ان پر سے پابندیاں ہٹا دی گئیں۔ اب وہ معزز شہری بن سکتے تھے۔ اس کے باوجود شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا ملک ہو، جہاں ان کے خلاف کسی قسم کی نفرت نہ پائی جاتی ہو۔ کم یا زیادہ نفرت ضرور پائی جاتی ہے۔ ان مراعات کا خاطر خواہ اثر ہوا اور یہودی جہاں کہیں آباد تھے، وہیں کے مستقل باشندے بن گئے۔ وہ کوئی دو ہزار سال سے غریب الدیار اور بے وطن مارے مارے پھر رہے تھے۔ فلسطین، جس میں شاید ہی کبھی وہ اطمینان سے رہ سکے ہوں، ان سے چھن چکا تھا۔ وہ ان کی نگاہوں میں بدستور مقدس تھا اور اس احساس تقدس کا مظہر وہ (Passover) کی سالانہ ضیافت تھی۔ جہاں ''آئندہ سال یروشلم میں'' کا لفظی ورد کیا جاتا تھا۔ اس رسم میں اس امید کا بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ یہودی کسی نہ کسی دن، کسی نہ کسی طرح ہیکل سلیمان (Temple of Soloman) کی از سر نو تعمیر کریں گے۔ یہودیوں کی یہ مقدس آرزو مستقل خطرہ ہے۔ کیونکہ ہیکل سلیمان کی جگہ، مسجد عمرؓ استوار ہے۔ ایک کی تعمیر، دوسری کی تخریب ہے۔ عرب (مسلمان) کہ حضرت سلیمانؑ کو بھی اپنا پیغمبر تسلیم کرتے ہیں، سلیمان کے ہیکل کو اپنی مسجد سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہیکل کی مسجد میں ''تبدیلی'' نہ تخریب ہے نہ نئی تعمیر۔ بلکہ ان کے نزدیک یہ سلک مسلسل ہے۔ یہودیوں کے نزدیک تعمیر مسجد غصب ہے۔ وہ اسے برباد کر کے ہیکل کی تعمیر کے متمنی ہیں۔ یہ بنیادی فرق علت ہے اس نزاع خونیں کی جس کی زد میں فلسطین ہے۔

مسلمانوں کی آمد

حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی کے عہد میں، یعنی رسول اللہ ﷺ کی وفات سے کوئی چار ہی سال بعد ۶۲۶ء میں مسلمانوں نے فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے لے کر ۱۹۱۷ء تک کہ جنرل ایلن بی نے ترکوں سے اسے فتح کر لیا۔ سوائے اس عرصہ کے کہ صلیبیوں نے لاطینی حکومت قائم کی، فلسطین پر ہمیشہ مسلمانوں کا قبضہ رہا۔ دسویں صدی میں عربی قوت وشوکت ان کی قبائلی عصبیت لہذا خانہ جنگی کے ہاتھوں کمزر ہو چکی تھی۔ ان کے مقابلہ میں ترک ابھر رہے تھے۔ گیارہویں صدی میں سلجوقی ترک میسوپوٹیمیا پر حملہ آور ہوئے اور خلیفہ وقت کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ گو بظاہر اسے خلیفہ ہی رہنے دیا۔ انہوں نے ۱۹۱۷ء تک ایشیا سے بازنطینی حکومت کا مکمل استیصال کر دیا۔ سلجوقیوں نے ۱۰۷۵ء کے قریب یروشلم پر بھی قبضہ کر لیا اور تابوت مقدس کو تباہ کر دیا۔ اس غارت نے تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ پوپ نے مقدس صلیبی جنگ کی تبلیغ شروع کر دی۔ تاکہ ''کافر'' ترکوں سے پورا انتقام لیا جائے۔ ایک ناکام کوشش کے بعد ۱۰۹۹ء میں، پاپائیان یورپ نے یروشلم پر حملہ اور ایک ماہ کے محاصرے کے بعد اسے فتح کر لیا۔ یروشلم کی گلیوں میں اس قدر کشت وخون ہوا کہ گھوڑوں کے ٹاپوؤں سے خون کے چھینٹے اڑ اڑ کر سواروں پر پڑتے تھے۔ ۱۱۰۰ء میں لاطینی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ ۱۱۶۹ء میں غازی صلاح الدین ایوبی نے مسلمانوں کے منتشر قویٰ کو مجتمع کیا اور عیسائیوں کے خلاف جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ ۱۱۸۷ء میں مسلمانوں کا یروشلم پر قبضہ ہو گیا۔ مسیحیوں نے شکست کھا کر تیسری صلیبی جنگ کی طرح ڈالی مگر ناکام رہے۔ چوتھی صلیبی جنگ برائے نام تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایوبی دور کے بھرپور وار کے بعد صلیبی بالکل نہیں سنبھل سکے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں پھر کبھی نہ آ سکے۔ اس کے بعد تاتاریوں کی ہلاکت سامانی کا سیلاب آیا اور گذر گیا۔ ازاں بعد ترکان عثمانی اٹھے جو یورپ میں بھی داخل ہو گئے۔ تھریس، بلغاریہ، مقدونیہ اور

سر دیا تک کو فتح کر لیا۔ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد خلافت کا اعلان کر دیا گیا جس کا الغا ۱۹۲۳ء میں مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں جنرل ایلن بی کے ہاتھوں فلسطین انگریزی قبضہ میں چلا گیا۔ تاریخ کے ان نشیب و فراز میں فلسطین اپنی جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر فاتحین کی جنگ آزمائیوں کا میدان بنا رہا۔

صیہونیت

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے فلسطین سے نکل جانے کے بعد یہودیوں کی آبادی فلسطین میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ کچھ یہودی جو بے چارگی کے عالم میں پیچھے رہ گئے تھے وہ اسی حال میں رہے تھے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں کہ یہ عرصہ مغربی قوائے استعمار کی خصوصی سرگرمی کا حامل ہے، بیرونی یہودیوں نے فلسطین میں قدرے دلچسپی لینی شروع کی جو کہ استعماریت کے پس منظر میں فلسطین کی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت کے پیش نظر ناگزیر تھا۔ تمام قوتیں اس اہم مرکز پر تسلط جمانا چاہتی تھیں۔ یہودیوں کی موجودگی سے عربی کی اہمیت اور قبضہ کو کم کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ کچھ یہودی خریدی ہوئی زمینوں پر آباد ہو گئے اور اس طرح ''نئی آبادیوں'' کی طرح ڈالی گئی۔ لارڈ راس چائلڈ اور دیگر امیر ترین یہودیوں کی بدولت سرمایہ کی کوئی کمی نہیں تھی۔ بلکہ مسرفانہ خرچ کیا جا سکتا تھا۔ متواتر پروپیگنڈے اور خیراتوں سے بیرونی یہودیوں کو جو اطمینان سے اپنے اپنے ملکوں میں رہ رہے تھے اور مطلقاً ترک وطن کے لئے تیار نہ تھے، ان کو رعب اور لالچ سے مجبور کیا گیا کہ وہ فلسطین جائیں، زمینیں خریدیں اور نئی یہودی آبادیاں بسائیں۔ لارڈ راس چائلڈ اور دوسرے سرمایہ دار یہودیوں نے ان آبادیوں کے قیام و ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ اس عالمگیر یہودی جدوجہد کا چنداں خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں یہودیوں کا تناسب آبادی بمشکل پانچ فی صد تھا جو پہلی عالم گیر جنگ کے آغاز تک سات فی صد سے زیادہ نہ ہو سکا۔ اختتام جنگ پر ۱۹۱۹ء میں یہ تناسب دس فی صد تھا۔ گویا سرمایہ کے بے تحاشہ صرف کے باوجود فلسطین اختتام جنگ اول تک مکمل عربی ملک تھا۔ کیونکہ عرب آبادی نوے فی صد تھی۔

یہودی سرمائے اور پروپیگنڈے کو بین الاقوامی حالات نے کافی کمک پہنچائی۔ ۱۸۸۱ء میں روس اور رومانیہ میں آباد یہودیوں پر مظالم کا بے پناہ ریلا آیا۔ یہودی چار و ناچار ان ممالک سے نکل پڑے۔ ان تارکین وطن کی حقیری تعداد عازم فلسطین بھی ہوئی۔ ان دنوں یورپ میں ایک انجمن ''محبان صیہون'' (Choveve Zion) قائم ہوئی جس نے یہودی تارکین وطن کا رخ سوئے فلسطین پھیرنے میں خاصی سرگرمی دکھائی۔ ۱۸۹۷ء میں ایک آسٹروی صحافی (Theodor Herzl) نے صیہونی سوسائٹی (Zionist Society) قائم کی۔ ہرزل کا مقصد یہ تھا کہ یہودی قومی اسٹیٹ میں اکٹھے ہو جائیں۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ ایسی اسٹیٹ فلسطین میں ہو۔ اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ ۱۹۰۳ء میں جب برطانوی حکومت نے یوگنڈا (Uganda) کو بطور موزوں یہودی سلطنت (قومی وطن) کے پیش کیا تو ہرزل نے اسے قبول کر لیا۔ البتہ جب یہ پیش کش صیہونی کانگرس کے سامنے آئی تو اس نے نامنظور کر دی۔ اس وقت ہرزل کا انتقال ہو چکا تھا۔ صیہونیت کا صدر مقام برلن تھا۔

یہودی استحقاق

فلسطین پر یہودی استحقاق بتایا جاتا ہے۔ اسی غرض سے ہم نے اوپر یہودی تاریخ کے اس حصہ کا سرسری جائزہ لیا ہے جو فلسطین سے متعلق ہے۔ اس مختصر سے تبصرہ سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ یہودی فلسطین پر ایک قلیل مدت کے لئے حکمران رہے۔ اس زمانہ اقتدار میں ہر چند انہوں نے مقامی باشندوں کا استیصال کرنے کی کوشش کی لیکن وہ انہیں صرف مغلوب کر سکے فلسطین سے ختم نہ کر سکے، نہ اکھاڑ پھینک سکے۔ اس مختصر دور حکومت کے علاوہ ان کی ساری داستان ذلت و

مسکنت اور تباہی اور بربادی کی داستان ہے۔ وہ ایک دفعہ فلسطین سے بے دخل ہوئے تو دو ہزار سال تک اس کی بازیافت کرسکنا تو درکنار اس میں معقول تعداد میں آباد بھی نہیں ہو سکے۔ ان کا فلسطین پر حق چند سالہ حکومت سے ہے۔ تاریخ و سیاست اول الذکر حق کو مطلقاً تسلیم نہیں کرتی۔ تاریخ ایک بھی ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ کوئی ملک کسی قوم کی تحویل میں اس لئے دے دیا گیا ہو کہ عہد ماضی میں وہ اس پر فرمانروا رہ چکی ہے۔ سیاست کا کوئی اصول اس دلیل بے معنی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اگر یہ دلیل حق ملکیت کے حق میں دی جاسکتی ہے تو اس کا فائدہ عربوں کو ملنا چاہئے' نہ کہ یہودیوں کو۔ فلسطینی (عرب) ہمیشہ فلسطین کے مالک رہے ہیں۔ وہ اس پر حکمران رہے ہوں' یا کسی اور قوم کے محکوم' وہ فلسطین کے مالک رہے' اسی سرزمین سے اٹھے اور اسی خاک میں مدفون ہوئے۔ ان کا جسمانی تعلق فلسطین سے کبھی منقطع نہیں ہوا۔ یہودیوں کو فلسطین بخش دینے کا مطلب تو یہ ہے کہ اسے پہلے ان سے چھینا جائے جو اس کے جائز مالک ہیں۔ لیکن عربوں کے حق میں تو یہی کافی ہے کہ وہ اس ملک میں ہیں اور اس کے بدستور مالک ہیں۔ ان کے ہاں انتقال ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جہاں تک فلسطین سے یہودیوں کی جذباتی وابستگی اور ''آئندہ سال یروشلم میں'' کی سالانہ رسم کا تعلق ہے اس کی حقیقت رسم کہن کے رسمی اعادہ سے زیادہ نہیں۔ اب تک جو یہودی فلسطین میں آکر آباد ہوئے ہیں۔ وہ' وہ ہیں جنہیں ان کے آبائی وطن سے نکال دیا گیا ہے اور جنہیں صیہونی سوسائیٹیوں نے مجبور کر کے فلسطین کی جانب بھیجا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ انگلستان اور امریکہ کے یہودی ترک وطن کر کے فلسطین میں نہیں آجاتے؟ کیا وہ ان یہودیوں کے مقابلہ میں جو اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور جنہوں نے فلسطین میں پناہ لی' کم ایمان دار۔۔ یہودی ہیں؟ بات صاف ہے۔ چونکہ ان یہودیوں پر ظلم و تعدی نہیں ہو رہا' اس لئے ''آئندہ سال یروشلم میں'' دہرانے کے باوجود اپنا ملک چھوڑ کر فلسطین جانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ خود راس چائلڈ اور دیگر سرمایہ دار یہودی فلسطین میں آکر آباد نہیں ہوئے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ فلسطین یہودیوں کا قلبی مطالبہ نہیں' بلکہ خصوصی اغراض و مصالح سے انہیں عرب مظلومین پر ٹھونسا جا رہا ہے اور عربوں کو آبائی وطنوں سے نکالا جا رہا ہے۔ اس طرح ان بدبختوں کے لئے اور مصیبت پیدا کی جا رہی ہے۔ یہودیوں کو یوں فلسطین پر ٹھونسنا' حملہ کرنے کے مترادف ہے۔

یہودی استحقاق کی دوسری وجہ مذہبی ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ فلسطین کے پیغمبر تھے اور یہودی' اول الذکر کو اپنا قومی ہیرو تصور کرتے ہیں۔ یروشلم یہودیوں کا مذہبی مرکز ہے۔ یہ دلیل دیتے وقت اس بین حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ خود عربوں کے لئے فلسطین اتنا ہی تقدس کا حامل ہے جتنا یہودیوں کے لئے۔ وہ پیغمبر جنہیں یہودی اپنا سمجھتے ہیں درحقیقت اسلام (لہٰذا مسلمانوں) کے پیغمبر ہیں۔ مسلمان ان پیغمبروں کا احترام ہی نہیں کرتے ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھی اس خاک کا ذرہ ذرہ مقدس ہے کہ وہ عروج و زوال اقوام کی الٰہی مشیت کے پروگرام کا آئینہ بردار ہے اور ایمان و عمل کی بے نظیر تجربہ گاہ۔ مسلمان کی تاریخ فلسطین کے بغیر نامکمل ہے۔ مسلمان نے اس رشتہ عزیز کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھا اور اسے جان سے عزیز تر رکھا' اب وہ اسے ہاتھ سے کیسے جانے دے سکتا ہے؟ یہودی اس رشتہ کو دو ہزار سال سے گم کر چکا ہے۔ وہ اسے ہاتھ میں لے سکتا ہے تو مسلمان کا سینہ چیر کر۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن مقامات پر مسلمان کا سینہ دو نیم ہوا ہے وہ تاریخ کے فیصلہ کن مقامات تھے۔ آج ہم پھر ایسے ہی فیصلہ کن مقام پر ہیں۔ زندہ قوموں کا ہر مرحلہ ہوتا ہی فیصلہ کن ہے!

عرب

یہودی تاریخ کے سرسری جائزہ سے ان کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا عربوں کی تاریخ دہرانے کا یہ موقع نہیں۔ یوں بھی عربی تاریخ ایسا گم شدہ باب نہیں جسے کوشش سے نمایاں کیا جائے۔ البتہ رابطہ قائم کرنے کے لئے ہم مختصراً

تازہ ابواب پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔ ترکوں کے دور حکومت میں عالم عرب پر عمومی طور پر جمود چھا گیا۔ ان کے بیداری کے آثار ۱۷۴۷ء سے شروع ہوتے ہیں جب اس تحریک کی داغ بیل ڈالی گئی جسے وہابی تحریک سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کا آغاز عرب سے محمد ابن عبدالوہاب نے کیا جس کا مقصد اسلام کو ان آلائشوں سے پاک کرنا تھا جو دمشق اور بغداد میں اس کا لازمہ بن چکی تھیں۔ چونکہ ترکی حکومت عربوں کے لئے سیاسی غلامی کا باعث سمجھی یا سمجھائی جانے لگی تھی، اس لئے بتدریج ان میں آزادی خواہی کے جذبات پیدا ہوتے گئے۔ وہابی جیسی اصلاحی تحریک نے بیداری کے آثار پیدا کئے تو سیاسی غلامی نے ان کا رخ سیاست کی طرف ہی پھیر دیا۔ ۱۸۷۵ء میں پانچ نوجوانوں نے مل کر بیروت میں ایک خفیہ سیاسی انجمن کی طرح ڈالی۔ ایسی خفیہ انجمنوں کی سرگرمیاں آہستہ آہستہ ترکی کے خلاف بھی ہوتی گئیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں یورپی اقوام، زندگی کی نئی تڑپ محسوس کر رہی تھیں۔ ان کے فکری ارتقاء میں مادیت کو دخل تھا اور کئی ایک فلسفی وحشیانہ قوت کے علمبردار تھے۔ چنانچہ اقوام یورپ قومی تغلب کے نشہ میں بدمست ہو کر دنیا کے مختلف خطوں میں اپنے اپنے وقار کے لئے دوڑ دھوپ کر رہی تھیں۔ ۱۸۶۰ء میں دمشق اور لبنان میں مسلم، عیسائی فسادات ہوئے جن میں عیسائیوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ ان فسادات کو بہانہ بنا کر نام نہاد عیسائی سلطنتوں نے مشرق وسطیٰ کے امور میں دخیل ہونا شروع کر دیا۔ یورپی قویٰ کی یہ مداخلت بتدریج بڑھتی گئی اور غیر یورپی ممالک ان کی باہمی رقابتوں کی آماجگاہ بن گئے۔ برطانیہ برصغیر پر قابض تھا، وہ انگلستان سے برصغیر تک کا راستہ محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ بحر روم اور بحر قلزم کے سواحل اس کے لئے مخصوص فوجی اہمیت رکھتے تھے۔ چنانچہ اس نے ۱۸۸۲ء میں مصر اور سوڈان پر قبضہ کر لیا۔ فرانس نے الجیریا (۱۸۳۰ء) اور تیونس (۱۸۸۱ء) پر قبضہ کر لیا۔ جرمنی نے بھی مشرق وسطیٰ پر للچائی ہوئی نگاہیں ڈالنا شروع کر دیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اٹلی نے بحر روم کو رومی جھیل بنانے کے قصد سے لیبیا کی رگ جان میں اپنے خونی پنجے گاڑ دیئے۔ یہ سلسلہ جنگ عالمگیر تک جاری رہا اور ممالک اسلامیہ استعمار فرنگ کا یا براہ راست شکار ہو گئے یا بالواسطہ اس کے زیر اثر آ گئے۔

اندرونی خرابیوں اور بدنظمیوں اور مغربی قوتوں کی ریشہ دوانیوں کے طفیل ترکی، مرد بیمار، بن چکا تھا۔ ترکی اب تک خلافت اسلامیہ کا حامل تھا۔ اس کے دم سے بظاہر ممالک اسلامیہ ایک مرکز سے وابستہ تھے۔ یہ وابستگی جذباتی تھی۔ لیکن سیاست نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔ عربوں کو ترکوں کے خلاف شکایات تھیں۔ ترک اندرونی اور بیرونی مصائب میں مبتلا تھے۔ اس پر مستزاد استعمار کا سیلاب اور قوائے مغرب کی باہمی رقابت تھی۔ آتش فشاں پہاڑ بالآخر پھوٹا اور ۱۹۱۴ء میں جنگ عمومی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ترکی جنگ میں جرمنی اور آسٹریلیا کا حلیف بنا۔ خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے سلطان ترکی نے جہاد کا اعلان کیا۔ اس اعلان کا اثر شام یا ممالک عربیہ تک ہی محدود نہ تھا بلکہ برصغیر کے مسلمانوں تک بھی تھا۔ برطانیہ کے لئے یہ عظیم الشان خطرہ تھا جس کا سدباب اشد ضروری تھا۔ کچنر کی سیاسی پیش بینی کو اس خطرہ کا احساس جنگ سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔ چنانچہ فروری ۱۹۱۴ء میں وہ حسین ابن علی، شریف مکہ سے اس کے دوسرے بیٹے عبداللہ کی معرفت مل چکا تھا۔

عرب اور برطانیہ

عرب، خود متفرق اور غیر منظم تھے۔ حسین، شریف مکہ، اپنی خلافت کا خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ ترکی کے خلاف انگریز سے سازش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن عربوں پر اسے یہ اعتماد نہیں تھا کہ وہ وحدت عربیہ پر جمع ہو جائیں گے۔ اس کا دوسرا بیٹا عبداللہ پرامید تھا۔ وہ والد کی طرف سے کچنر، سٹارس اور بعد میں سر ہنری میکموہن سے مصروف گفتگو رہا۔ حسین کا تیسرا بیٹا فیصل ترکی کی معاونت کو ترجیح دیتا تھا، تاکہ اس پر احسان کر کے معاہدہ امن میں کچھ حاصل کیا جائے۔ حسین نے عبداللہ سے اتفاق کیا۔ بقول لارنس، حسین، فیصل سے متنفر بھی تھا۔ چنانچہ

حسین نے انگریزوں سے مذاکرات جاری رکھے۔ اس کے ساتھ اس نے الفطاط' الاحد جیسی انقلابی جماعتوں سے بھی مراسم قائم کر لئے۔ کیونکہ وہ ترکوں کے خلاف کہیں زیادہ باغیانہ سرگرمی دکھا رہی تھیں۔ جنگ جاری رہی۔ انگریز' ترکوں اور جرمنوں کے ہاتھوں ..... پیہم شکستیں اٹھاتے جا رہے تھے۔ اب موقع تھا کہ عالم عرب کو ترکوں سے علیحدہ کیا جائے اور اپنے زیر اثر کیا جائے تا کہ انہیں ترکوں کے خلاف صف آرا کیا جا سکے۔ ایسے میں رسوائے عالم میکموہن مراسلت کا آغاز ہوا۔ میکموہن مصر میں برطانوی ہائی کمشنر تھا۔

حسین کا مطالبہ عرب آزادی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ عربی حکومت کی مغربی سرحد بحر قلزم اور بحر روم تک ہو۔ اس تحدید میں عرب' عراق' شرق اردن' فلسطین اور شام شامل تھے۔ میکموہن نے اسے تسلیم کرتے ہوئے ان اضلاع کو نکال دیا جو دمشق' حمص' حماد اور حلب کے مغرب میں واقع تھے۔ کیونکہ وہ علاقے خالصتاً عربی نہ تھے۔ اس ''مغرب'' کی بعد میں یہ توجیہہ کی گئی کہ اس سے فلسطین عربی سلطنت کی حدود سے خارج ہو گیا تھا۔ خود میکموہن نے ایک مرتبہ لندن ٹائمز میں لکھا کہ جن علاقوں سے متعلق وعدے کئے گئے تھے ان میں فلسطین شامل نہیں تھا۔ یہ قطعی غلط ہے اس لئے کہ میکموہن نے عربی سلطنت کی حد بحر روم تک تسلیم کر لی تھی۔ اس سے فلسطین خود بخود عربی حکومت میں آ جاتا تھا۔ اگر بغرض استدلال اس شرط کو ساقط سمجھ لیا جائے تو نقشہ پر دیکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ فلسطین دمشق کے مغرب میں نہیں بلکہ جنوب مغرب میں ہے ایسی دور از کار اور احمقانہ توجیہیں برطانوی سیاست کا لازمہ ہیں۔ خود پاکستان کو ان کا کس قدر تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ فلسطین کو خارج کرنے کی ایک اور ایسی ہی لچر دلیل دی جاتی ہے۔ میکموہن نے ایک شرط یہ لگائی تھی کہ عربوں کے مطالبات تسلیم کرنے میں برطانیہ فرانس کے مفاد کے منافی اقدام نہیں کرے گا۔ فلسطین میں فرانس کا مفاد کچھ بھی نہیں تھا۔ لہٰذا' یہ شرط فلسطین کے معاملہ میں ساقط العمل ہو جاتی ہے۔ یوں بھی

اس کے اخراج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فلسطین کو نکال کر عربی حکومت اور وحدت عربیہ کا مطالبہ بے معنی ہو جاتا تھا۔ ایک حلقہ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے' کہ چونکہ انگریز نے فلسطین کو فتح کیا تھا اس لئے اسے حق حاصل تھا کہ وہ اس کا کچھ بھی ''استعمال'' کرتا۔ قومیں جائیدادیں نہیں ہوتیں کہ ان پر حق ملکیت تسلیم کیا جائے اور جیسے جی میں آئے ان کا استعمال کیا جائے۔ بیسویں صدی کی مہذب دنیا میں اس متروک و مردود نظریہ کو اساس گفتگو نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ طرز استدلال غمازی کر رہا تھا کہ فرنگی ذہن سیاسی استبداد و ظلم سے اوپر نہیں اٹھ سکا۔ ایسے حضرات نے ایبی سینیا پر اٹلی کا حق ملکیت کبھی تسلیم نہیں کیا۔ نہ انہوں نے چین کے مفتوحہ علاقے میں جاپان کا حق تسلیم کیا۔ اٹلی اور جاپان کے خلاف ان کی دی ہوئی دلیلیں خود ان کی تردید اور تغلیط کے لئے کافی ہیں۔

کرنل لارنس نے جنگ کے دوران عربی جذبات وطنیت کو ابھارنے میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ ایلن بی نے اکتوبر ۱۹۱۷ء میں جب فلسطین میں جارحانہ کارروائی شروع کی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریز ایک حلیف ملک میں لڑ رہے ہیں اور ترک دشمن ملک میں ہیں۔ عرب سپاہی ترک فوجوں سے بھاگ بھاگ کر آ رہے تھے اور ترکی عساکر کا سلسلہ رسد و رسائل درہم برہم ہو رہا تھا۔ ایلن بی کے الفاظ میں عربی کی امداد ''بے بہا'' تھی۔ لائڈ جارج نے موتمر امن (۱۹۱۹ء) میں اعتراف کیا۔

> شاہ فیصل نے اپنے تمام ذرائع ہمارے سپرد کر دیئے جس سے ہم کو مادی طور پر سب سے زیادہ مدد ان فتوحات میں ملی۔

جنگی امداد کے علاوہ عربوں نے انگریز کو کامیاب و فاتح بنانے کے لئے کیا کیا' اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگائیے:-

> ان (عربوں) کے گھر کی ایک ایک چیز خوراک' خریدنے میں صرف ہو گئی۔ حتیٰ کہ ان کی چھتوں کی

۱۹۱۷ء کی ہے) پندرہ ماہ بعد جب بیروت فتح ہوا ہے تو حالات اور بگڑ چکے تھے۔ یہ کہنا شک وشبہ سے مبرا ہے کہ جنگ کے دوران تین لاکھ شامی فاقوں مر گئے۔ صحیح شمار ساڑھے تین لاکھ کا ہے۔ کوئی تین ہزار جیلوں میں جھونک دیئے گئے جن میں سے بیشتر نے اجل ہو گئے۔ شام کی چالیس لاکھ آبادی میں سے پانچ لاکھ کے لگ بھگ جنگ میں کام آئی۔

(The Arab Awakening)

عربی آزادی

عرب مسلمان تھے۔ انہوں نے ترکی دعوت جہاد کی کیوں پروانہ کی لارنس کے الفاظ میں:-

دوران جنگ میں عربوں کی ترکوں کے خلاف بغاوت اس لئے نہیں تھی کہ ترکوں کی حکومت خراب تھی' بلکہ اس لئے کہ عرب آزادی چاہتے تھے۔ انہوں نے جنگ کی آگ میں اپنی جانیں اس لئے نہیں جھونکیں تھیں کہ وہ آقاؤں کی تبدیلی کریں اور برطانوی رعایا بن جائیں یا فرانسیسی شہری' بلکہ وہ اپنا صحیح مقام حاصل کرنا چاہتے تھے۔ (لارنس کے خطوط)

ترکوں کے دور نے عربوں میں بڑی حد تک جذبات قومیت و آزادی پیدا کر دیئے تھے۔ انگریز نے اس کا فائدہ اٹھایا اور عربوں کو آزاد عربستان کا سبز باغ دکھایا۔ عربوں کا اس دام میں آجانا عہد ماضی کا قدرتی نتیجہ تھا۔ ترکی اور جرمنی اتحاد کی شکست کی واحد صورت یہی تھی کہ مشرق وسطیٰ سے ان کو بے دخل کر دیا جاتا۔ اپنی اہمیت کے پیش نظر مشرق وسطیٰ جنگ کے نتیجہ کے لئے فیصلہ کن حیثیت رکھتا تھا۔ انگریز نے یہیں اپنے قدم جمانے کی کوشش کی۔ انگریز کی وسیع سلطنت کے لئے مشرق وسطیٰ خصوصیت سے اہم تھا۔ چنانچہ عربوں کو ترکوں سے علیحدہ کرنے کے لئے انگریز نے کمال فراخدلی سے ان سے وعدے کئے۔ چونکہ مقصد عربوں کو ترکوں کے خلاف صف آراء کرنا تھا' اس لئے وعدوں کی معقولیت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اس سلسلہ میں انگریز نے ہر اس چیز کا وعدہ کیا جو وہ کر سکتا تھا اور جس کا نتیجہ عربوں کو ترکوں سے علیحدہ کرنا ہو سکتا تھا۔

عربوں کی شرکت جنگ وطنی آزادی کی خاطر تھی اور انگریز نے اس کا حتمی وعدہ کر رکھا تھا۔ لیکن وہ اپنے قول میں کس قدر مخلص تھا' اس کا اندازہ اس وقت کے واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔ میکموہن نے اگست ۱۹۱۵ء میں حسین کو لکھا:-

لارڈ کچنر نے جو اعلان علی آفندی کی معرفت آپ تک پہنچایا ہے جس میں ہماری ممالک عربیہ اور ان کے باشندگان کی آزادی کی خواہش کا اظہار ہے' ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

خفیہ معاہدہ

مئی ۱۹۱۶ء میں جب عرب یقینی طور پر انگریزوں کے حلیف بن چکے تھے۔ برطانیہ اور فرانس میں ایک خفیہ معاہدہ (Sykes Picot Agreement) طے ہوا۔ اس معاہدہ میں ہر چند برطانیہ (اور فرانس) کے اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ وہ ایک آزاد عرب حکومت یا مغربی وفاق کے موید ہیں' لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے معاہد ممالک عربیہ کو حلقہ ہائے اثر (برطانوی اور فرانسیسی) میں تقسیم کرنے میں اتفاق کر لیا۔ اس معاہدہ کی رو سے فلسطین کو بین الاقوامی علاقہ قرار دے دیا گیا۔ ذرا غور کیجئے! معاہدہ عربی ممالک سے متعلق ہو رہا ہے اور عربوں سے انگریز کے حتمی مواعید موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود فرانس سے یکطرفہ معاہدہ کر لیا جاتا ہے جو اس معاہدہ کی صریح خلاف ورزی ہے جو عربوں سے کیا جا چکا تھا۔ اگر سائیکس' پکٹ معاہدہ برطانیہ کے سابقہ مواعید کے مطابق تھا تو اسے حسین سے پوشیدہ کیوں رکھا گیا؟ کیا یہی بات شک کے لئے کافی نہیں تھی؟ استعمار فرنگ کی یہ بداخلاقی اور بددیانتی بین الاقوامی سیاست کا طرۂ امتیاز ہے اور بین الاقوامی مسائل کی کہ ان میں سے اہم فلسطین ہے' علت العلل ہے' روسی حکومت نے اس خفیہ معاہدہ کو شائع کر دیا اور حسین نے فوراً میکموہن کو اس کے متعلق لکھا تو میکموہن نے اسے ترکی کی شر انگیز کوشش قرار دیتے ہوئے عربوں کی یوں تشفی کی کہ

برطانیہ پہلے کی طرح عزم مصمم کئے ہوئے ہے کہ وہ وحدت و استقلال عربیہ کی تشکیل وتقویم کرے گا۔ انگریز کی اس منافقت کا انکشاف ہونے سے عربوں کے ایک حلقہ میں نہ صرف انگریز سے متعلق بلکہ خود حسین کے متعلق شکوک پیدا ہو گئے۔ چنانچہ سات عرب زعماء نے برطانیہ کو ایک یادداشت بھیجی، جس کے جواب میں وزارت خارجہ (برطانیہ) نے The Declaration to Seven) شائع کیا۔ اس اعلان میں پھر اعادہ کیا گیا۔

جن عربی ممالک پر اتحادی فوجوں نے قبضہ کیا ہے، ان کے متعلق ملک معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ان ممالک کی آئندہ حکومت متعلقہ باشندوں کی رضا مندی سے تشکیل پذیر ہو۔ جو علاقے ابھی تک ترکوں کے قبضہ میں ہیں، ان کے متعلق ملک معظم کی حکومت کی خواہش ہے کہ ان علاقوں کے غلام باشندے خود مختاری اور آزادی حاصل کریں۔ ملک معظم کی حکومت اس مقصد کی تکمیل میں بدستور کوشاں رہے گی۔

۷/نومبر ۱۹۱۷ء کو فلسطین، شام اور عراق کے کونے کونے میں ایک اعلان چسپاں کرایا گیا جس میں تحریر تھا:-

مشرق وسطیٰ میں جرمنی نے جس جنگ کی طرح ڈالی ہے اس میں شریک ہوتے ہوئے برطانیہ اور فرانس کے پیش نظر مقصد ان لوگوں کی مکمل اور حتمی آزادی۔ (Complete and Final Liberation) ہے جو اب تک ترکوں کے غلام چلے آئے ہیں۔ نیز ایسی قومی حکومتوں کی تشکیل جو مقامی باشندوں کے آزادانہ انتخاب و فیصلہ کا نتیجہ ہوں گی۔ برطانیہ اور فرانس کسی قسم کا بھی نظام حکومت اپنی طرف سے مسلط نہیں کریں گے۔ بلکہ وہ ایسی موثر امداد دیں گے جس سے وہ حکومتیں بخوبی چل سکیں۔

عربوں سے ایک مرتبہ نہیں، دو مرتبہ نہیں، بیسیوں مرتبہ وعدے ہوئے کہ ایک عرب ریاست یا عربی ریاستوں کا وفاق قائم کیا جائے گا۔ لیکن موتمر امن اور اس کے مابعد عربوں کو تقسیم اور تقسیم در تقسیم کے سوا کچھ نہ ملا۔ سیریا کو شام، لبنان، فلسطین، عراق اور شرق اردن میں تقسیم کر دیا گیا۔ بقیہ شام کو آزادی نہیں دی گئی بلکہ مجبور کیا گیا کہ وہ انتداب قبول کرلے، انتداب ایک ''بدعت'' تھی جو جمعیت اقوام نے پیدا کی۔ نہ اس کا عربوں کی طرف سے مطالبہ ہو سکتا تھا، نہ انگریزوں کی طرف سے وعدہ۔ وعدہ خالص آزادی کا تھا جسے پہلو بدل بدل کر ٹالا گیا۔ عراق، حسین کے بیٹے، فیصل کو بخش دیا گیا۔ شرق اردن اس کے بیٹے عبداللہ کو۔ شام، فرانس کے انتداب میں دے دیا گیا اور فلسطین برطانیہ کے انتداب میں۔ کیا یہ فیصلے ان وعدوں کے مطابق تھے جو جنگ کے دوران عربوں سے کئے گئے تھے؟ کیا عربوں کا مطالبہ انتداب کا تھا؟ کیا یہ نئی حکومتیں مقامی باشندوں کی رضامندی سے متشکل ہوئی تھیں؟ عراق نے انتداب کی مخالفت کرتے ہوئے بامر مجبوری امریکی انتداب کو ترجیح دی، لیکن اسے انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا۔ یوں مقامی باشندوں کے ان مطالبات وحسیات کو ٹھکرایا گیا جس کے احترام کے حتمی اور مکرر وعدے موجود تھے۔ لارنس لکھتا ہے:-

فرانس نے دیوانہ وار انتداب بدلنے کی کوشش کی۔ برطانیہ نے شرمناک سودا کر کے اس (فرانس) کی تائید کی۔ تاکہ وہ میسو پوٹیمیا حاصل کر سکے۔ س۔پ۔۔۔ معاہدہ کی رو سے فرانس کو ساحل ملا اور عربوں کو حلب، حما، حمص، دمشق اور شرق اردن۔ انتداب کے صدقے میں اکثر و بیشتر حصے انگلستان اور فرانس نے ہتھیا لئے۔ س۔پ معاہدہ تحدید میں احمقانہ تھا مگر اس میں شام کا حق مختاری تسلیم کیا گیا تھا۔ یہ (معاہدہ)۔ آئندہ فیصلے سے دس ہزار گنا بہتر تھا۔

(باقی آئندہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکتوب پرویزؒ

خوانندگان کرام! دوسرا مکتوب پرویزؒ حاضر خدمت ہے یہ مکتوب بھی ہمیں نمائندہ بزم طلوع اسلام لندن محترم مقبول محمود فرحت صاحب کے توسط سے ملا ہے۔ اس خط کا پس منظر انہی کی زبانی سنئے:

''حافظ سرور کوہاٹی صاحب کے تقسیم ہند سے قبل دہلی میں پرویزؒ صاحب سے مراسم تھے۔ حافظ صاحب کی ایک کتاب ''حقائق اسلام'' کی اشاعت میں پرویزؒ صاحب کا تعاون واعانت شامل تھی۔ ..... پاکستان بننے کے بعد ایک اور کتاب کی اشاعت میں پرویزؒ صاحب سے مدد چاہی جو غالباً احادیث کے رد میں تھی۔ پرویز صاحب نے معذرت کر دی۔ کچھ عرصہ بعد یہ یہاں (برطانیہ) آ گئے اور کئی سال London 12-Shepherd Bush کے علاقہ میں رہے۔ ..... حافظ سرور کوہاٹی کے ہماری بدولت مرحوم محمد رفیق خواجہ صاحب سے تعلقات قائم ہوئے۔ خواجہ صاحب ہر کسی سے سیکھنے کی جستجو کرتے (تھے) ..... حافظ صاحب نے بہت پہلے مجھے کہا (تھا) کہ پرویز صاحب کی بعض تشریحات غلط ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ تو ان کو ذاتی طور پر جانتے ہیں' براہ راست لکھیں یا آپ لکھیں ہم بھیج دیں گے۔ کسی طرح انہوں نے خواجہ صاحب کو قائل کر لیا کہ پرویزؒ نے ''مقام حدیث'' میں غلط حوالے دیئے ہیں ..... اس وقت بزم لندن کے نمائندہ مقصود حسین کیانی مرحوم تھے مگر ادارہ سے تمام خط و کتابت' حساب کتاب' کتابوں کی خرید وفروخت' درسوں کا انتظام۔ میزبانی میرے سپرد تھی۔ کوئی علمی بحث کرنا ہوتی تو کیانی صاحب خود پرویزؒ صاحب کو لکھ دیتے ..... خواجہ صاحب نے کیانی صاحب کو کہا ..... کہ حافظ سرور کا اعتراض معقول ہے' پرویز صاحب کو جواب دینا چاہئے لہذا حافظ صاحب نے اعتراضات خواجہ صاحب کو تحریر کر دیئے اور کیانی صاحب نے احادیث کے بارے متعلقہ حصہ مضمون لاہور بھیج دیا۔ پرویزؒ صاحب نے ۲ اپریل ۱۹۸۰ء میں اس کا آٹھ صفحات کا جواب دیا۔'' لیجئے قارئین کرام دوسرا مکتوب پرویز ملاحظہ فرمائیے۔

عزیز محترم۔ السلام علیکم

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۱۱ مارچ مجھے مل گیا تھا۔ اس کے جواب میں تاخیر کی وجہ شیخ حمید صاحب نے اپنے خط (مورخہ ۲۲ مارچ) میں آپ کو لکھ دی تھی' اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ مخالفین کی طرف سے اس قسم کی بحثیں کس مقصد کے لئے چھیڑی جاتی ہیں۔

۲۔ بہت عرصہ کی بات ہے' حافظ سرور صاحب کوہاٹی نے مجھ سے راہ ورسم پیدا کی تھی۔ یہ معاشی مشکلات میں گرفتار تھے۔ اس میں تو کوئی عیب کی بات نہیں تھی لیکن میں نے دیکھا کہ یہ اس مسئلہ کے حل کے لئے جائز و ناجائز ہر حربہ استعمال کر لینا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی ہمارے ہاں کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ میں نے انہیں مسترد کر دیا اور یہ ناراض ہو گئے۔ اس پر عرصہ اتنا دراز گذر چکا ہے کہ مجھے اس معاملہ کی تفاصیل یاد نہیں۔ یونہی دھندلا سا تصور ذہن میں ہے۔ اس کے بعد ان کا کیا ہوا مجھے معلوم نہیں بجز اس کے کہ یہ باہر چلے گئے تھے۔ اب آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ یہ اس رنگ میں انتقام لینے

کے لئے آگے بڑھے ہیں۔ اس قسم کے فتنہ کا علاج شیخ حمید صاحب اپنے خط میں لکھ چکے ہیں۔

۳۔ جیسا کہ میں نے اپنی کتاب۔۔ ''ختم نبوت اور تحریک احمدیت'' کے ابتدائیہ میں لکھا ہے' میں احمدیوں کے خلاف پچاس ساٹھ سال سے برسر پیکار چلا آ رہا ہوں۔ پہلا دور بحث ومباحثہ کا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں بہاولپور کے مشہور مقدمہ میں میرے ایک مقالہ کی بنا پر انہیں دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا گیا تھا تو میں نے متعلقہ حضرات سے کہا کہ ان لوگوں سے بحث ومباحثہ کے بجائے قانونی لڑائی لڑنی چاہئے۔ قانونی لڑائی کے سلسلہ میں انہیں ۱۹۷۴ء میں آئینی طور پر دائرہ اسلام سے خارج قرار دیدیا گیا۔ اس سے میرا مقصد حاصل ہو گیا۔ چنانچہ اس کے بعد میں نے انہیں درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ اگرچہ یہ اب بھی مجھے اپنا دشمن اول تصور کرتے ہیں۔ اور وہ ایسا سمجھنے میں حق بجانب بھی ہیں۔

۴۔ معترض کا پہلا اعتراض طبری کے متعلق ہے۔ جیسا کہ میں نے اس اعتراض کے جواب میں لکھا ہے۔ جس مقالہ پر اعتراض کیا گیا ہے وہ میرا مقالہ ہے ہی نہیں۔ اس لئے اس کی جوابدہی میری ذمہ داری نہیں۔ بایں ہمہ' میں نے اس کا بھی مختصر الفاظ میں جواب لکھ دیا ہے۔ اس سے کم از کم آپ احباب کی معلومات میں اضافہ ہو جائے گا۔

۵۔ احمدیوں کے متعلق میں نے اپنے جس طرز عمل کی طرف اوپر اشارہ کیا ہے' اس کے پیش نظر میں معترض کے اعتراض کو کچھ اہمیت نہ دیتا' لیکن چونکہ یہ آپ کو درمیان میں لے آیا ہے اس لئے میں نے جواب دینا ضروری سمجھا۔ اگرچہ بادل نخواستہ۔ اس لئے کہ میری عمر کے اب جو گنے چنے دن باقی رہ گئے ہیں' میں انہیں اس قسم کی لایعنی بحثوں میں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ کام بہت باقی ہے' اور وقت بہت کم۔ مجھے تو اب فی الواقعہ ''ایک ایک قطرے کا حساب'' رکھنا پڑتا ہے۔

۶۔ میں اس ملک میں قریب چالیس سال سے چومکھی لڑائی لڑتا چلا آ رہا ہوں۔ میرے مخالفین گدھوں اور چیلوں کی طرح' چاروں طرف منڈیروں پر بیٹھے' میری طرف عقابی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ اگر انہیں میرے خلاف کچھ بھی قابل گرفت مل جاتا تو میری تکا بوٹی کر دیتے۔ اللہ کا شکر ہے انہیں نہ آج تک ایسا کچھ ملا ہے' نہ مل سکے گا۔ اس لئے آپ مطمئن رہیں۔ میں اس باب میں بڑی احتیاط برتتا ہوں۔۔ اس لئے نہیں کہ مخالفین کو گرفت کا موقع نہ مل سکے بلکہ بنیادی طور پر اس احساس کے ماتحت کہ اگر میری کسی بے احتیاطی کی وجہ سے قرآنی فکر کے فروغ پر کسی قسم کا حرف آ گیا تو عدالت خداوندی میں یہ ایسا جرم ہوگا جس کی سزا بڑی سنگین ہوگی۔ میں دعا کرتا ہوں اور آپ میری اس دعا میں شریک ہو جائیے کہ اللہ مجھے (اور ہم سب کو) اس سے محفوظ رکھے۔

۷۔ اعتراضات کے جواب منسلک ہیں۔ آپ معترض سے کہہ دیجئے کہ اگر اسے اس باب میں مزید کچھ کہنا ہے تو' مصنف زندہ ہے۔ اس سے براہ راست بات کرے۔ اسی طرح اگر کوئی اور صاحب بھی کسی قسم کا اعتراض کریں تو ان سے بھی آپ کہہ دیا کریں کہ وہ مصنف سے براہ راست پوچھیں۔ آپ حضرات اس کی طرف سے جوابدہی کے مکلّف نہیں۔ اس سے یہ لوگ تحریک کے کاموں کی طرف سے آپ کی توجہ برطرف کرنے کی سازش میں ناکام رہ جائیں گے۔

۸۔ میں حالیہ مرض کی گرفت سے تو بچ نکلا ہوں لیکن کمزوری بہت بڑھ گئی ہے۔ معلوم نہیں عمر کے اس حصہ میں اس کا ازالہ بھی ہو جاتا ہے یا نہیں۔ اس خط کو اپنے ہاتھ سے نہ لکھ سکنے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ وہاں کے احباب سے میرا سلام کہہ دیں۔ والسلام۔ خیر طلب۔ پرویز' ۲/اپریل ۱۹۸۰ء

اعتراض (۱)..... تفسیر طبری

معترض نے جس مضمون کو مورد اعتراض قرار دیا ہے' وہ مضمون میرا ہے ہی نہیں۔ وہ پہلے طلوع اسلام بابت اگست ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ اس پر بھی میرا نام نہیں۔ پھر وہ ''مقام حدیث'' میں شائع ہوا تو اس میں بھی میرا نام نہیں ہے۔ قریب تیس سال کے عرصہ کے بعد مجھے یہ بھی یاد نہیں پڑتا کہ یہ مضمون کن صاحب کا تھا۔ اس کی تمہید میں البتہ یہ تحریر ہے

کہ یہ شیعہ مجتہد سید علی نقوی صاحب کے ایک رسالہ ''متعہ اور اسلام'' پر مبنی ہے (مقام حدیث۔ ایڈیشن ۱۹۷۶ء۔ ص ۱۰۔۲۰۹)۔ جب یہ مضمون میرا ہے ہی نہیں تو اس کی مدافعت بھی میری ذمہ داری نہیں۔۔۔۔ البتہ ایک غیر جانبدار قاری (یا اہل قلم) کی حیثیت سے جب میں اسے دیکھتا ہوں تو مجھے اس میں بد دیانتی کا کوئی قرینہ نظر نہیں آتا۔ صاحب مقالہ کے پیش نظر یہ واضح کرنا تھا کہ ہماری کتب روایات میں اس قسم کی روایات موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہد رسالتمآبؐ اور دور صحابہؓ میں متعہ کی اجازت تھی اور اس پر عام عمل ہوتا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک اہم روایت حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ متعلقہ آیت درحقیقت نازل ہی ''الی اجل مسمی'' کے اضافہ کے ساتھ ہوئی تھی۔ (مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ) چونکہ صاحب مقالہ کے پیش نظر تفسیر طبری پر محاکمہ نہیں تھا۔ متعہ سے متعلق روایات کا سامنے لانا مقصود تھا۔ اس لئے انہوں نے متعلقہ اقتباس تک اکتفا کیا اور طبری کی رائے کا نقل کرنا ضروری نہ سمجھا' اگرچہ (میں سمجھتا ہوں کہ) اگر وہ اسے بھی نقل کر دیتے تو اس سے نفس مضمون پر کچھ اثر نہ پڑتا کیونکہ وہ محض طبری کی رائے تھی' اور طبری کی آراء کس قدر وقیع ہوتی ہیں اہل علم اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔

طبری شیعہ تھا اور اس نے سنیوں کے لباس میں تفسیر بھی لکھی اور تاریخ بھی (اس کی شیعیت کے متعلق ہفتہ وار طلوع اسلام کی مئی ۱۹۵۵ء کی تین اشاعتوں میں علامہ تمنا عمادی (مرحوم) کا نہایت مفصل تحقیقاتی مقالہ شائع ہو چکا ہے) تفسیر میں اس کا انداز یہ ہے کہ وہ ہر قسم کی (رطب و یابس) روایات درج کرتا چلا جاتا ہے اور ان پر تنقید کیئے بغیر ایک آدھ فقرہ میں اپنی ایسی رائے دے دیتا ہے جو بعض روایات کے خلاف جاتی ہے اور بعض کے حق میں۔ اس طرح وہ اپنے قاری کے دل میں شکوک اور وساوس پیدا کر دیتا ہے کہ خدا جانے کون سی بات صحیح ہے اور کون سی غلط۔ زیر نظر مسئلہ میں بھی اس نے ایسا ہی کیا ہے۔ اس نے وہ روایات بھی درج کر دی ہیں جن سے متعہ کا جواز ثابت ہوتا ہے اور آخر میں ایک دو ایسی روایات بھی جن سے متعہ کی ممانعت اور حرمت ثابت ہوتی ہے۔ (مذکورہ بالا مقالہ میں بھی متعہ کے جواز اور حرمت کی روایات درج ہیں) طبری نے متعہ کے جواز کی روایات پر کوئی تنقید نہیں کی حالانکہ جب اس کی رائے میں متعہ حرام تھا تو اس کا فریضہ تھا کہ وہ ان روایات کی حقیقت واضح کرتا جن سے متعہ کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ والی روایت کے سلسلے میں بھی وہ ایسی پہلو دار بات کہہ گیا ہے جسے معترض سمجھ ہی نہیں سکا۔ اس نے (معترض کے ترجمہ کے الفاظ میں) کہا یہ ہے کہ:-

> جو کچھ ابی بن کعبؓ اور ابن عباسؓ کی قرأتوں میں روایت ہے: فما استمتعتم به منهن الی اجل مسمی۔ پس یہ قرأت مصاحف المسلمین کے خلاف ہے اور کسی شخص کے لئے بھی یہ جائز نہیں کہ اللہ کی کتاب میں کچھ الحاق وغیرہ کرے جس کی بابت کوئی قاطع خبر (حدیث نبویؐ) نہ ہو۔

اس سے (معترض کی طرح) سطح بیں نگاہیں یہی سمجھیں گی کہ طبری اسے جائز ہی نہیں سمجھتا کہ کتاب اللہ میں کسی قسم کا الحاق کیا جائے لیکن درحقیقت وہ الحاق کا جواز ثابت کر گیا ہے۔ اس نے کہا یہ ہے کہ ''کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں کہ اللہ کی کتاب میں کچھ الحاق وغیرہ کرے جس کی بابت کوئی قاطع خبر (حدیث نبویؐ) نہ ہو۔'' یعنی طبری کے نزدیک' کتاب اللہ میں الحاق کی قطعی ممانعت نہیں۔ اس الحاق کی اجازت ہے جس کی سند میں کوئی قاطع حدیث ہو۔ شیعہ مذہب کا تو مدار ہی الحاق پر ہے اور وہ اس کی سند میں اپنے آئمہ معصوم کی روایت کردہ احادیث پیش کر دیتے ہیں جو ان کے نزدیک قاطع ہیں۔ سنیوں کے ہاں البتہ بحث و نزاع کا دروازہ کھل گیا کیونکہ ان کے ہاں سب سے پہلے یہی سوال تصفیہ طلب ہوتا ہے کہ کون سی روایت قاطع ہے اور کون سی غیر قاطع۔ آپ نے دیکھا کہ طبری صاحب ایک ہی تیر سے کس طرح دو شکار کر گئے ہیں؟

طبری نے کتمان حقیقت سے بھی کام لیا ہے۔ اس کی رائے سے ایسا نظر آتا ہے گویا اختلاف قرأت صرف (حضرت) ابی بن کعبؓ اور ابن عباسؓ کے ہاں ہے اور کسی کے ہاں نہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف قرأت کا میدان بڑا وسیع ہے۔ اس موضوع پر طلوع اسلام بابت نومبر ۱۹۵۲ء میں ایک مفصل مقالہ شائع ہوا تھا۔ وہ ملخصاً مقام حدیث میں بھی شامل ہے۔ اس کا عنوان ہے ''قرآن کریم روایات کے آئینے میں'' (ایڈیشن ۱۹۷۶ء، ص ۲۸۵)۔ اس سے معلوم ہوگا کہ ان روایات کی رو سے بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ کے ہاں اپنے اپنے مصاحف تھے جو اختلاف قرأت کی رو سے مصحف عثمان (یا طبری کے الفاظ میں مصاحف المسلمین) سے مختلف تھے اور ان اختلافی قرأتوں کی تعداد سینکڑوں، بلکہ ہزاروں تک پہنچتی ہے (مقام حدیث۔ ص ۳۰۷) یہ تمام تفصیل امام ابن ابوداؤد کی تالیف ''کتاب المصاحف'' میں مذکور ہے۔ صاحب کتاب المصاحف طبری کے ہمعصر تھے (طبری کی وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی تھی اور ابن ابوداؤد کی ۳۱۶ھ میں) اس لئے طبری یقیناً ان مصاحف کی موجودگی سے واقف ہوں گے۔۔۔۔ یوں بھی انہیں ان سے واقف ہونا چاہئے تھا کیونکہ ان کا تذکرہ تو روایات میں پھیلا ہوا تھا اور امام ابن ابوداؤد نے بھی انہیں ان ہی روایات سے اخذ کیا تھا۔ لیکن امام طبری نے قرأت حضرت ابن عباسؓ کے خلاف رائے دیتے ہوئے اس کا قطعاً ذکر نہیں کیا کہ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن کعبؓ کے علاوہ دیگر جلیل القدر صحابہؓ کے پاس بھی الحاقی مصاحف موجود تھے۔

باقی رہی اختلاف قرأت کے متعلق طبری کی رائے تو اس کی وقعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اختلافات قرأت کا وجود سنیوں اور شیعوں دونوں کے ہاں مسلمہ کی حیثیت اختیار کیئے چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ آپ نے مختلف تفاسیر یا تراجم کے حواشی پر لکھا دیکھا ہوگا کہ یہ آیت قرآن مجید میں تو یوں ہے لیکن فلاں صحابی کی قرأت میں یوں بھی آئی ہے۔ معترض جن احمدیوں کی حمایت میں اٹھے ہیں ان کے پیشواء مرزا غلام احمد اپنے دعوائے محدثیت کی سند حضرت ابن عباسؓ کی اختلافی قرأت ہی سے لائے ہیں (بحوالہ ختم نبوت اور تحریک احمدیت۔۔ نقش ثانی ص ۲۷۵۔۲۷۴) اور سید ابو الاعلیٰ مودودی (مرحوم) وضو میں پاؤں دھونے اور پاؤں پر مسح کرنے کی سند بھی اختلافات قرأت ہی سے لائے ہیں (ملاحظہ ہو مقام حدیث۔ ایڈیشن ۱۹۷۶ء۔ ص ۳۱۶)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اگر متعہ سے متعلق مقالہ میں طبری کی رائے درج نہیں کی گئی تو اس سے کسی قسم کی تحریف یا بددیانتی لازم نہیں آتی۔ بہرحال جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے مجھے صاحب مقالہ کی مدافعت مقصود نہیں۔ میں نے اس مقام پر ان تصریحات کا درج کرنا ایک تو اس لئے مناسب سمجھا ہے کہ اس سے معترض کی معلومات میں اضافہ ہو جائے اور دوسرے یہ کہ اگر میں اس قسم کا کوئی مقالہ لکھتا تو اس میں طبری کی رائے کے ساتھ یہ تصریحات بھی سامنے آ جاتیں۔

اعتراض (۲)۔۔ احمدیوں سے متعلق۔

احمدیوں کے معاملے میں مشکل یہ ہے کہ ان کا سارا لٹریچر تضادات کا مجموعہ ہے۔ خود مرزا صاحب کی کتابیں مجموعہ اضداد ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں ہر دعوے کی تائید اور تردید میں اقوال مل جاتے ہیں۔ آپ ایک اعتراض کیجئے۔ یہ اس کی تردید میں اس کے خلاف اقتباس پیش کر دیں گے۔ میں قریب پچاس سال تک ان کے خلاف برسر پیکار رہا اس لئے ان کے اس داؤ پیچ سے میں بخوبی واقف ہوں۔ خود مرزا صاحب بڑے فخر سے کہتے تھے کہ انہوں نے یہ انداز اس لئے اختیار کیا کہ ان کے مخالف علماء اس پیچ میں پھنس جائیں (ختم نبوت اور تحریک احمدیت۔ دوسرا ایڈیشن۔ ص ۸۹) مثلاً۔ ان کے دعوائے نبوت کو لیجئے۔ وہ اپنے آپ کو برملا نبی کہتے رہے۔ جب اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ ان کی تحریروں میں جہاں جہاں نبی کا لفظ آیا ہے اسے کاٹا ہوا خیال کیا جائے (ختم نبوت اور تحریک

احمدیت۔ص ۹۸)۔لیکن اس کے بعد پھر اپنے آپ کو نبی کہتے رہے حتیٰ کہ انہوں نے اپنی وفات کے تین دن پہلے اخبارات میں ایک خط چھپوایا جس میں لکھا تھا:۔

میں خدا کے حکم کے مطابق نبی ہوں اگر میں اس سے انکار کروں تو میرا گناہ ہوگا اور جس حالت میں خدا میرا نام نبی رکھتا ہے تو میں کیونکر اس سے انکار کر سکتا ہوں۔ میں اس پر قائم ہوں اس وقت تک جو دنیا سے گذر جاؤں۔ (ختم نبوت اور تحریک احمدیت۔ ص ۲۵۶)۔

ان کے ان ہی تضادات کا نتیجہ ہے کہ لاہوری جماعت اور قادیانی جماعت ساٹھ' ستر سال سے ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں ہیں لیکن آج تک یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ مرزا صاحب کا دعویٰ کیا تھا؟

اسی قسم کے تضادات مرزا صاحب کے متبعین کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں اس لئے ان کی کسی ایک تحریر کو آخری سند کے طور پر پیش کر دینا' فریب دہی ہے یا ان کے لٹریچر سے عدم واقفیت کی دلیل۔ (مثلاً) لاہوری جماعت کا دعویٰ ہے کہ وہ مرزا صاحب کو صرف مجدد مانتی ہے اور اس کے برعکس ان کا یہ دعویٰ بھی موجود ہے کہ:۔

ہم حضرت مسیح موعود اور مہدی معہود کو اس زمانے کا نبی' رسول اور نجات دہندہ مانتے ہیں..... ہمارا ایمان ہے کہ اب دنیا کی نجات حضرت نبی اکرمؐ اور آپ کے غلام حضرت مسیح موعود پر ایمان لائے بغیر نہیں ہو سکتی۔ (دونوں حوالوں کے لئے دیکھئے ختم نبوت اور تحریک احمدیت۔ ص ۲۵۲۔۲۵۳)۔

یا مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ''ہر کلمہ گو مسلمان ہے اور مسیح موعود کو نہ ماننے سے وہ قابل مواخذہ تو ہوتا ہے لیکن دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہو جاتا''۔ (ایضا۔ ص ۲۵۳)۔ اس کے برعکس مرزا صاحب کا اعلان ہے کہ جو انہیں مسیح موعود نہیں مانتا وہ کافر ہے (ایضا۔ ص ۳۰۶)۔ اور لاہوری حضرات اس کی تردید نہیں کرتے۔ حالانکہ انہیں اس کا چیلنج بھی دیا گیا تھا۔ (دیکھئے طلوع اسلام۔ اپریل ۱۹۷۵ء۔ ص ۲۱)۔

اس کے علاوہ ان لوگوں نے بہت سی اصطلاحات وضع کر رکھی ہیں جن کا کوئی مفہوم متعین نہیں کیا جاتا۔ انہیں مبہم رکھا جاتا ہے تاکہ حسب منشا ان کا مفہوم بدلتے رہیں۔ مثلاً ظلی نبی' بروزی نبی' امتی نبی' مجازی نبی' جزوی نبی' غیر تشریعی نبی وغیرہ۔ یا مثلاً مامور من اللہ' ملہم' مجدد' محدث' امام زمان۔ یا مکالمات' مخاطبات' مکاشفات وغیرہ۔

اس تمہید کے بعد آیئے معترض کے اعتراض کی طرف نبی اور رسول کا فرق خود مرزا صاحب نے اپنے اس مشہور مصرعہ میں بیان کیا تھا کہ۔۔۔ من نیستم رسول نیاوردہ ام کتاب۔۔۔ یعنی رسول صاحب کتاب ہوتا ہے اور میرا دعویٰ نبی کا ہے جو بلا کتاب آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی:۔

اس کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ میں صاحب شریعت نہیں ہوں رسول اور نبی ہوں مگر بغیر کسی جدید شریعت کے۔۔ اگر کوئی شخص اس وحی الٰہی پر ناراض ہو کہ کیوں خدا تعالیٰ نے میرا نام نبی اور رسول رکھا ہے تو یہ اس کی حماقت ہے کیونکہ میرے نبی اور رسول ہونے سے خدا کی مہر نہیں ٹوٹتی۔ (ایک غلطی کا ازالہ۔ ص ۶۔۷)

یعنی ان پر خدا کی طرف سے وحی تو نازل ہوتی ہے لیکن اس وحی میں جدید شریعت نہیں ہوتی اس لئے وہ نبی اور رسول تو ہیں لیکن بلا کتاب۔ من نیستم رسول نیاوردہ ام کتاب' کے یہی معنی ہیں۔

اس کی وضاحت وہ دوسری جگہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

''شریعت والا نبی کوئی نہیں آ سکتا اور بغیر شریعت کے نبی ہو سکتا ہے'' (تجلیات الٰہیہ ص ۲۶)۔

مولانا محمد علی لاہوری اسی تشریعی اور غیر تشریعی نبوت کے قائل ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی تفسیر بیان القرآن (ایڈیشن ۱۳۴۰ھ میں لکھتے ہیں:۔

یہی وجہ ہے کہ اس پر قریباً قریباً امت کا اتفاق ہے کہ

نبوت اپنے لغوی معنی کی رو سے یعنی محض خدا سے ہم کلام ہونے کے معنی میں تو اس امت میں جاری ہے مگر نبوت اپنے خاص یا اصطلاحی مفہوم میں مسدود ہے۔ چنانچہ روح المعانی میں ہے (عربی عبارت) یعنی نبوت عام ہے اور خاص اور وہ جس میں اس امت کے لئے ذوق (یعنی حصہ) نہیں وہ نبوت خاصہ ہے یعنی تشریعی نبوت اور وہ ولایت میں مقام خاص ہے اور رہی نبوت عامہ سو وہ اکابر امت میں جاری و ساری ہے..... لیکن نبوت خاصہ یعنی جسے اصطلاح شریعت میں نبوت کہا جاتا ہے یا جس کا نام نبوت تشریعی ہے..... وہ اس امت میں بند ہے (ص ۵۳۲۔۵۳۳)

لاہوری جماعت کا عقیدہ ہے کہ ایسا شخص نبی کہلا سکتا ہے (ملاحظہ ہو ختم نبوت اور تحریک احمدیت ص ۲۰۰۔ زیر عنوان ''مرزا صاحب تحریف بھی کرتے تھے)۔

نبی ہی نہیں بلکہ (مولانا) محمد علی لاہوری کے نزدیک مجددین کو مجازاً رسول کہنا بھی جائز ہے۔ (تفسیر ص ۸۸)۔

جب ۱۹۷۴ء میں پاکستان کی مجلس قانون ساز نے احمدیوں کو قانوناً دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا تو احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا جس کا عنوان تھا ''آئین پاکستان میں نئی ترمیم کا مفہوم''۔ اس میں کہا گیا ہے کہ شیخ اکبر ابن عربی کا عقیدہ ہے کہ نبوت بغیر تشریع کے باقی ہے:-

اور یہی حضرت مرزا صاحب اور احمدیہ انجمن اشاعت کا مذہب ہے کہ غیر تشریعی نبوت' نبوت نہیں بلکہ اجزائے نبوت ہیں۔ ملاحظہ ہوں مرزا صاحب کے حسب ذیل الفاظ ''اس بات کو بخصور دل یاد رکھنا چاہئے کہ یہ نبوت جس کا ہمیشہ کے لئے سلسلہ جاری رہے گا۔ نبوت تامہ نہیں بلکہ جیسا کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں وہ صرف ایک جزوی نبوت ہے۔ (ص ۱۹)۔

ان تصریحات سے بھی واضح ہے کہ لاہوری احمدیوں کے نزدیک تشریعی نبوت جسے نبوت تامہ کہا جاتا ہے مسدود ہے لیکن غیر تشریعی نبوت جسے جزوی نبوت کہا جاتا ہے جاری ہے اور یہی (ان کے بقول) مرزا صاحب کا دعویٰ ہے۔ یعنی نبی بلا شریعت۔

پھر اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ یہ حضرات شریعت کو کتاب کہتے ہیں (مولانا) محمد علی اپنی تفسیر میں کہتے ہیں:-

سلسلہ بنی اسرائیل میں انبیاء کے آنے کو اب بطور نعمت بیان کیا ہے اور اول سلسلہ حضرت موسیٰ اور آخر سلسلہ حضرت عیسیٰ کا نام لیکر باقی ناموں کو چھوڑ دیا۔ کتاب سے مراد یہاں شریعت کی کتاب ہے جو حضرت موسیٰ کو دی گئی۔ (ص ۸۸)۔

اس تشریح سے بھی واضح ہے کہ مولانا محمد علی کے نزدیک شریعت سے مراد کتاب ہے اور کتاب سے مراد شریعت۔ اس اعتبار سے تشریعی سے مراد ہوگی صاحب کتاب نبی اور غیر تشریعی نبی کے معنی ہوں گے نبی بلا کتاب۔ ان تشریحات کی روشنی میں سوچئے کہ لاہوری جماعت احمدیہ کے متعلق میں نے جو کچھ کہا ہے اس میں کون سی غلط بیانی ہے؟ میں نے کہا یہ ہے:-

لاہوری حضرات جب اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ مرزا صاحب نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا تھا رسول ہونے کا نہیں۔ تو کہتے ہیں کہ مرزا صاحب نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا تھا' رسول ہونے کا نہیں۔ نبی اور رسول میں فرق یہ ہے کہ رسول صاحب کتاب ہوتا ہے اسے تشریعی نبی کہتے ہیں اور نبی بلا کتاب اسے غیر تشریعی کہتے ہیں۔ مرزا صاحب بلا کتاب آئے تھے اس لئے صرف نبی تھی۔ (ختم نبوت اور تحریک احمدیت ص ۲۵۷)

مختصر الفاظ میں لاہوری احمدیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ مرزا صاحب غیر تشریعی نبی یعنی نبی بلا کتاب تھے۔

معترض نے اپنے دعوے کی تائید میں (مولانا) محمد

علی کی کتاب ''النبوۃ فی الاسلام'' کا ایک اقتباس بھی نقل کیا ہے اس میں انہوں نے کہا ہے:-

جن لوگوں نے کتاب سے لازماً شریعت مراد لی ہے ان کو اس آیت کے سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے۔ کتاب سے مراد لازماً شریعت نہیں بلکہ شریعت کتاب کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ بعض انبیاء پر شریعت نازل ہوئی بعض پر نہیں۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ کچھ نہ کچھ رسالت اور پیغام ہر نبی اپنے رب کی طرف سے لاتا ہے۔ پس جو اس کی رسالت ہوتی ہے وہی درحقیقت اس کی کتاب کہلاتی ہے۔

مولانا صاحب نے اس میں جو پیچ رکھا ہے معترض اسے سمجھ ہی نہیں سکا۔ انہوں نے اس سے غیر تشریعی ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا ہے یعنی ان کے دعوے کی رو سے ایسے انبیاء بھی گذرے ہیں جنہیں کتاب تو ملی تھی لیکن شریعت نہیں ملی تھی۔ یعنی وہ فرماتے ہیں کہ بعض کتابیں ایسی بھی تھیں جن میں احکام شریعت نہیں تھے۔۔۔ کیا کہنے ہیں ان کتابوں کے جن میں احکام نہ ہوں؟ انہیں خدا کی کتابیں کہنے کی بجائے پند نامہ کہنا چاہئے اور ایسے انبیاء کو واعظ!

لیکن دیکھئے کہ اس کے بعد مولانا صاحب اپنی تردید آپ کرنے پر کس طرح مجبور ہو رہے ہیں۔ سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۴۴ کو لیجئے جسے میں نے ختم نبوت اور تحریک احمدیت کے ص ۲۶۰ پر نقل کیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل ''توراۃ'' کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور اس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ انہیں الگ کتابیں نہیں ملی تھیں۔ اس کی تفسیر میں مولانا صاحب لکھتے ہیں:-

اصل بات یہ ہے کہ توراۃ میں بے شک ایک شریعت بنی اسرائیل کو دی گئی مگر وقتاً فوقتاً جو انبیاء ظاہر ہوتے رہے وہ اس شریعت کی تکمیل کرتے رہے اور اس کے ساتھ ہی جو کچھ توراۃ میں تھا اس کے مطابق فیصلے بھی کرتے رہے۔ یہ دونوں امر ایک دوسرے کے نقیض نہیں کیونکہ وقتی ضرورتوں کے مطابق تغیر و تبدل اصل شریعت کو باطل نہیں کرتا جس طرح باوجود تحریف ہو جانے کے فیصلے اس کے مطابق ہوتے تھے اور یہ فرما کر کہ انجیل میں ہدایت و نور ہے (آیت نمبر ۴۶) جس طرح توراۃ میں ہدایت و نور تھا یہ بھی بتا دیا کہ توراۃ (انجیل) کی نوعیت ایک ہے۔ ایسا ہی ان جملہ کتب کی جو دیگر انبیاء بنی اسرائیل پر نازل ہوئیں۔ (ص ۶۲۳)۔

مولانا صاحب کی اس تفسیر سے واضح ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد جو انبیاء بنی اسرائیل آتے رہے وہ توراۃ میں دی گئی شریعت کی تکمیل بھی کرتے رہے اور وقتی ضرورتوں کے مطابق تغیر و تبدل بھی۔ اس لئے جو کتابیں ان انبیاء کو دی گئیں ان کی نوعیت توراۃ کی سی تھی۔

اس کے بعد کوئی مولانا صاحب سے پوچھے کہ جب ان تمام کتابوں میں احکام شریعت دیئے گئے تھے تو وہ کون سی کتابیں تھیں جن کے متعلق آپ نے کہا ہے کہ ان میں احکام شریعت نہیں ہوتے تھے' صرف پند و نصائح ہوتے تھے؟

اور آگے بڑھئے سورۃ الانعام کی آیات نمبر ۸۴۔۸۹ میں قریب قریب ان تمام انبیاء کا نام لیا گیا ہے جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے اور اس کے بعد آیت نمبر ۹۰ میں کہا گیا ہے: اولئک الذین اتینھم الکتب والحکم والنبوۃ۔ یعنی ان تمام انبیاء کو کتاب' حکم اور نبوت عطا کیئے گئے تھے۔ اس کی تفسیر میں مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ:-

باوجود اس کے کہ بعض انبیاء کو بادشاہت ملی بعض کو نہیں ایک امر میں ان سب کا اشتراک بیان فرمایا ہے کہ ان سب کو کتاب اور حکم اور نبوت ضرور ملے۔ کتاب وہ وحی ہے جو نبی پر اس کی امت کی ہدایت کے لئے نازل ہوتی۔ حکم وہ اختیار ہے جو نبی کو دیا جاتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کا مطیع نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کو اپنی اطاعت کی طرف بلاتا ہے جو اس کی امت کہلاتے ہیں۔ اور نبوت بلحاظ لغت وہ پیش گوئیاں

ہیں جو اس کو دین کی تائید کے لئے دی جاتی ہیں اور یا اس سے مراد یہاں سفارت ہے (نمبر ۹۱) اور گو کتاب اور حکم نبوت میں شامل ہیں مگر ان دو خاص باتوں کا ذکر اس لئے کیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ منصب نبوت کی یہ ضروری شرائط ہیں۔ یعنی ایک کتاب کا دیا جانا اور دوسرا حکم یا اختیار کا دیا جانا۔ (ص ۶۹۴)۔

سوال یہ ہے کہ انبیاء کو جو حکم اور اختیار دیا جاتا تھا جس کی اطاعت کے لئے وہ دوسروں کو اپنی طرف بلاتے تھے وہ حکم ان کی کتاب کے اندر ہوتا تھا یا اس سے کہیں باہر؟ اگر وہ ان کی کتاب کے اندر ہوتا تھا تو پھر مولانا صاحب نے جو کہا ہے کہ بعض کتابیں ایسی بھی ہوتی تھیں جن میں صرف پند و نصائح ہوتے تھے' احکام شریعت نہیں ہوتے تھے' تو اس کے کیا معنی ہیں؟ اگر وہ انبیاء اپنی کتاب سے باہر سے حکم دیتے تھے تو پھر اس کا کیا جواب ہے جو خدا نے فرمایا ہے: ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون (۵/۴۴)۔ اللہ تعالیٰ تو خارج از کتاب حکم دینے کو کفر قرار دیتا ہے!

اس سلسلے میں ان کے لئے حضرت موسیٰ اور ہارونؑ کا مسئلہ بڑی دشواری پیش کرتا تھا۔ اس کا حل انہوں نے یہ پیش کیا کہ توراۃ ملی تو ان دونوں کو تھی مگر:-

چونکہ بعض قسم کے کام جیسے عبادت وغیرہ کا کرانا حضرت ہارون کے سپرد تھے اس لئے اس کے متعلق حضرت ہارون کو وحی ہوئی ہو گی اور مستبین بلحاظ تفصیلات شریعت اسے کہا (ص ۱۵۸۶)۔

یعنی پہلے تو مولانا صاحب نے حکم اور عبادت میں تفریق کر دی تاکہ یہ کہہ دیا جائے کہ اگر مرزا صاحب کو حکومت نہیں ملی تھی تو کوئی بات نہیں حضرت ہارونؑ کی طرح ان کا منصب نماز روزے تک محدود تھا۔ لیکن اس کے بعد اسے بھی شریعت سے تعبیر کر دیا۔ اگر عبادات سے متعلق تفصیلات بھی شریعت تھیں تو پھر ان سے کوئی پوچھے کہ وہ کتابیں کون سی تھیں جن میں احکام شریعت نہیں تھے؟

اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن مجھے نہ اس کی فرصت ہے نہ ضرورت' اتنے سے ہی ایک غیر متعصب قاری اس کا اندازہ لگا سکے گا کہ احمدی حضرات کا لٹریچر کس قدر تضادات' ابہامات اور التباسات کا مجموعہ ہے اور یہ کس طرح اپنی تحریروں میں الجھاؤ پر الجھاؤ پیدا کرتے چلے جاتے ہیں اور ان کے ہاں اپنے ہر دعوے کی تائید اور تردید میں مواد موجود ہوتا ہے۔ اگر ان سے کہا جائے کہ آپ قرآن مجید سے ثابت کیجئے کہ خدا کی طرف سے کوئی ایسی کتاب بھی آئی تھی جس میں احکام شریعت نہیں تھے اور کوئی ایسا نبی بھی تھا جسے غیر تشریعی کہا گیا ہو تو وہ قیامت تک اس کا جواب نہیں دے سکیں گے۔ لیکن آپ کو لفظوں کے گورکھ دھندے میں الجھاتے چلے جائیں گے۔ لیکن ان سے اب کسی بحث مباحثہ کی ضرورت نہیں۔ حکومت نے انہیں قانوناً غیر مسلم قرار دے دیا ہے۔ اگر انہیں اس کے خلاف کچھ کہنا ہے تو یہ حکومت کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ آخر میں' میں ایک ضمنی گوشہ کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نے اپنی کتاب (ختم نبوت اور تحریک احمدیت) کے ص ۲۵۷ کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ ''ہم متعین طور پر نہیں کہہ سکتے کہ ان دعاوی میں سے کون کون سے دعوے قادیانی احمدی کرتے ہیں اور کون کون سے لاہوری احمدی یہ دعاوی بہرحال احمدی حضرات کی طرف سے پیش کیئے جاتے ہیں''۔ تشریعی اور غیر تشریعی نبوت کے سلسلے میں' میں نے بالتخصیص لاہوری حضرات کا نام لیا ہے اور جو کچھ میں نے سابقہ صفحات میں لکھا ہے اس سے واضح ہے کہ یہ حضرات اس کے قائل ہیں۔ باقی رہے وہ دلائل جن کا ذکر میں نے اپنی کتاب کے ص ۲۵۹ پر کیا ہے' ان میں بالتخصیص لاہوری جماعت کا نام نہیں لیا گیا۔ جو آیات میں نے اس سلسلہ میں پیش کی ہیں مولانا محمد علی نے ان کی من مانی تاویلات سے جس طرح (معاذ اللہ) ان کا حلیہ بگاڑا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ باقی رہے قادیانی (ربوی) حضرات تو ان کا معاملہ ان سے الگ ہے۔

(پرویز 2-4-80)

قرآں کے اثر کو روک دینے کے لئے
ہم لوگوں پہ راویوں کا لشکر ٹوٹا
(اکبرالہ آبادی)

علامہ اسلم جیراج پوری کی خوبصورت اور فکر انگیز کتاب
ہمارے دینی علوم (علم تفسیر، تفسیر بالروایت، علم حدیث، علم فقہ)
قیمت 75 روپے (علاوہ ڈاک خرچ)
☆ ملنے کا پتہ ☆ مکتبہ اخوت، الکریم مارکیٹ، سیکنڈ فلور، اردو بازار، لاہور۔

عطیات برائے کراچی بلڈنگ پراجیکٹ

تصحیح

گذشتہ شمارہ میں عطیات برائے کراچی بلڈنگ فنڈ کے عنوان کے تحت مسز ریحانہ صاحبہ کے نام کے تحت 28,000 روپے سہواً شائع ہو گئے تھے۔ دراصل وہ عطیات درج ذیل افراد کی جانب سے بزم طلوع اسلام لندن کی وساطت سے ادارہ کو موصول ہوئے تھے۔ ادارہ ان احباب کے نام شائع نہ ہونے پر معذرت خواہ ہے۔ صحیح تفصیل حسب ذیل ہے۔

-1	محترمہ ریحانہ صاحبہ، کلے ہال، انگلینڈ	4000 روپے
-2	محترمہ مسز زرینہ خان صاحبہ، والتھم سٹو، انگلینڈ	4000 روپے
-3	محترم مظہر بشیر راجہ صاحب، ہیکنے، انگلینڈ	4000 روپے
-4	محترم وقار احمد صاحب، والتھم سٹو، انگلینڈ	8000 روپے
-5	محترم عبدالشکور صاحب، کنگز بری، انگلینڈ	8000 روپے
-1	محترم نعیم خان صاحب، لندن، انگلینڈ	160 پونڈ
-2	محترم لیاقت علی صاحب، معرفت لندن بزم، انگلینڈ	200 روپے
-3	عبدالرحمن، میر پور خاص، سندھ	500 روپے

عطیات برائے پشاور کیس فنڈ

-1	محترمہ کونسلر شمع احمد صاحبہ، معرفت بزم طلوع اسلام لندن	2000 روپے
-2	محترم فرید بابر، معرفت بزم طلوع اسلام لندن	800 روپے
-3	بزم طلوع اسلام لاہور	5000 روپے

سانحہ ہائے ارتحال

پرانے وابستہ دامن قرآنی محمد یوسف بٹ کالا گوجراں، جہلم میں گذشتہ ماہ وفات پا گئے۔ مرحوم 35 سال ادارہ کے ساتھ منسلک رہے۔ دعا ہے کہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب ہو۔ ادارہ مرحوم کے اعزہ واقرباء کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

تحریک طلوع اسلام کے دیرینہ شیدائی اور باغبان ایسوسی ایشن کے صدر محترم ملک حنیف وجدانی صاحب کی اہلیہ محترمہ وفات پا گئی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ ادارہ ملک حنیف وجدانی صاحب اور مرحومہ کے دیگر اعزہ واقارب کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر منصور الرحمٰن، پشاور

کیریکٹر کی اہمیت اور جدید سائنس

ساری انسانی تاریخ میں کیریکٹر Character بظاہر ایک اخلاقی Moral مسئلہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ اب کہیں جا کر سائنسی تحقیق نے اس کی اہمیت کو اجاگر کر دیا ہے کہ ذہنی ارتقاء اور اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کو حاصل کرنے میں اس کی بنیادی اہمیت ہے۔ کیریکٹر کو نظر انداز کرنے سے ذہنی ترقی تو چھوڑیئے آپ جو کچھ By Chance حاصل کر چکے ہیں اس کو بھی ضائع کر بیٹھیں گے۔ کیریکٹر کو آسان لفظوں میں یوں بیان کیا جاتا ہے کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہی آپ کر کے دکھاتے ہیں اور مستقل طور پر ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس سے لوگوں کا آپ پر بھروسہ اور اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں لوگ آپ سے کسی بھی قسم کا معاملہ کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ جب کہ اس کے مقابلے میں جس شخص کے قول و فعل میں تضاد ہو تو ہر شخص اس سے پہلو تہی کرتا ہے اس طرح وہ شخص خود اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ایک مستقل دردسر ہوتا ہے۔

اتنی مادی ترقی اور بظاہر علمی سطح بلند ہونے کے باوجود آج ساری دنیا ایک جہنم بن چکی ہے اس کی وجہ یہ ہے ایک فرد دوسرے فرد پر اور ایک قوم دوسری قوم پر بھروسہ اور اعتماد نہیں کرتی جس سے مایوسی اور اداسی ساری دنیا میں پھیل گئی ہے دنیا کے کسی کونے میں چلے جایئے انسان اور انسانیت کراہ رہی ہے کہ ہم پر یہ کیا عذاب مسلط ہو گیا ہے۔ دانشور، سماجی و سیاسی رہنما خود پریشان ہیں کہ اپنی اپنی قوم کو کیسے اور کس طرح اس عذاب سے نکالیں اور ان کی اس پریشانی کی وجہ ''مادی ترقی'' کا نظریہ ہے جو ان کی زندگی کا مقصد حیات ہے یعنی Materialistic Concept of Life اس مادی نظریئے کی وجہ سے ہر شخص بے دریغ جھوٹ اور منافقت کا مظاہرہ کرتا ہے کیونکہ اس طرح اسے فائدہ ملتا ہے لہذا ذاتی مفاد ہر شخص کا مقصد حیات ہے لیکن..... اگر معاشرے میں سب ہی لوگ جھوٹ بولنے لگ جائیں تو معاشرہ ایک دن نہ چل سکے۔ معاشرے میں انتشار و بداعتمادی پھیل جاتی ہے اس کا جو نتیجہ ہوتا ہے آج وہ ہمارے سامنے ہے قتل و غارت، ڈکیتیاں، چوریاں، کرپشن چاہے کسی شکل میں ہو۔ یہ اسی شجر خبیث کے کڑوے پھل ہیں جو ہمیں کھانے پڑ رہے ہیں۔

ہم تو علمی اور عملی طور پر انتہائی پست سطح پر ہیں۔ آیئے ذرا ترقی یافتہ اقوام کی طرف چلیں کہ وہ اس مسئلے کو کیسے حل کر رہے ہیں۔ مغربی اقوام اپنے سارے مسائل کا حل ''عقلی اور عملی'' بنیاد پر کرتی ہیں (Rationally & Practically) کیونکہ بہت عرصہ پہلے وہ ''مذہب'' ''خدا'' اور ''اخلاقیات'' قسم کے تصورات کو روزمرہ زندگی سے خارج کر چکی ہیں۔ انقلاب فرانس اور انقلاب روس نے ان کے ماہرین سیاسیات و سماجیات کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ انہوں نے معاشی ناہمواری کو ختم یا کم کرنے کے لئے تو کوئی خاص نظریہ یا مقصد تو متعین نہیں کیا البتہ جمہوریت اور سوشل سیکیورٹی سسٹم (سماجی تحفظ کا نظام) ضرور رائج کیا تاکہ ہر شخص کو اپنی رائے دینے کا حق ہو اور دو وقت کی روٹی میسر ہو ورنہ یہ بھوکا اور غصیلا انسان دوسروں کی کیک پیسٹری بھی چھین کر لے جائے گا۔

اسی طرح انہیں صدیوں کے تجربے نے سکھایا کہ

اگر سیاسی لیڈر جو کہ قوم کے ہر فیصلے کا ذمہ دار ہوتا ہے جھوٹ بولے، دھوکا دے تو وہ قابل مذمت ہے۔ اس کو اس عہدہ سے استعفیٰ دینا پڑے گا ورنہ عدالتی کارروائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ اور بات ہے کہ وہی لیڈر اگر کسی دوسری قوم کو دھوکہ دے تو قابل تحسین یا قابل مواخذہ نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ ''سچ'' اور ''امانت'' کی عملی افادیت مغربی اقوام میں اب نمایاں ہو رہی ہے یعنی ان اصولوں کو عملی طور پر جانچ کر ایک قانون کی شکل دے دی ہے کہ ہمارا لیڈر ہر حالت میں ان اصولوں کو سامنے رکھے ورنہ حاکمیت سے دست بردار ہو جائے۔ اس کی بڑی بڑی مثالیں حالیہ دور میں سامنے آئی ہیں۔ مثلاً صدر نکسن کا واٹر گیٹ سکینڈل کی وجہ سے مستعفی ہونا، کلنٹن کا سیکس سکینڈل کی وجہ سے قوم اور بیوی سے بار بار معافی مانگنا، جاپانی وزراء اعظم کا مالیاتی گڑبڑ کی وجہ سے یکے بعد دیگرے استعفیٰ دینا۔ یہاں تک کہ کرکٹر آئن بوتھم کو ایک نرس سے ناجائز تعلق ثابت ہونے پر اپنی بیوی اور دوستوں سے اخبارات کے ذریعے معافی مانگنی پڑی۔ دوسرے الفاظ میں کفار نے اپنے لئے یہ دنیا درست کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے اور کس بنیاد پر؟ وہی جس پر ہادی برحقؐ نے انسانیت کا سب سے عظیم انقلاب برپا کیا تھا یعنی کیریکٹر (ذاتی کردار)۔ تاہم مغربی اقوام کا یہ اقدام ادھورا، کمزور اور محدود سا ہے جس سے ایک خاص دائرے میں تھوڑا سا اطمینان تو پیدا ہوا مگر پورا معاشرہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکا اور یہ ہو بھی نہیں سکتا۔ جب تک کہ معاشرے کے ہر پہلو میں اس ''سچ'' اور ''امانت'' کا چلن نہ ہو۔ کیریکٹر صرف چند مخصوص افراد اور حالات تک محدود رہ گیا ہے جس سے پبلک اور پرائیویٹ لائف کے تصورات تخلیق کر لئے گئے لیکن انسان اور انسان کے درمیان کیریکٹر کی اہمیت نہ سمجھی گئی لہذا ان لوگوں کی گھریلو زندگی عذاب بن کر رہ گئی ہے۔ جب معاشرے میں ''سچائی'' اور ''دیانت'' کا رواج نہ ہو تو اس معاشرے یا قوم میں سکون و اطمینان کی تلاش ایسے ہے جیسے ریگستان میں پانی کی تلاش۔

معاشرے میں سکون و اطمینان کیوں ضروری ہے! اس کا کیا فائدہ ہے؟ اس سے عام آدمی کی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں پر کیا اثر پڑتا ہے؟ جھوٹ بولنے میں کیا نقصانات ہیں اور سچ بولنے کا کیا فائدہ؟ جب تک ہم ان سوالات کا ''علمی و عقلی'' سطح پر جواب نہ دیں تو لوگوں کے دل مطمئن نہیں ہو سکتے اور ہم انہیں ''سچ اور دیانت'' کی بنیاد پر زندگی گزارنے پر آمادہ نہیں کر سکتے کیونکہ ہر شخص کی انا، مرضی، اختیار و ارادہ اس وقت تک حرکت میں نہیں آتا جب تک کوئی بات اس کے شعور میں نہ بیٹھ جائے۔ اس لئے قرآن نے بار بار ذہن انسانی کو غور و فکر کی دعوت دی ہے اور ایسے لوگوں کو وہ ''مومن'' اور حقیقت تک پہنچنے والے کا خطاب دیتا ہے۔

اسی حوالے سے موجودہ دور کی ایک بہت اہم مثال پیش خدمت ہے۔ آسٹریلیا کے جنگل نشین لوگ جنہیں Aborigines یا Bush People ان میں قدرتی طور پر ٹیلی پیتھی یا ادراک ماورائے احساس Extra-Sensory Perception کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یہ لوگ صرف آواز سن کر بتا دیتے ہیں کہ یہ فلاں انسان کی ہے یا جانور یا پرندے کی ہے وہ اس وقت کتنے فاصلے یا سمت میں ہے۔ سورج دیکھ کر وقت صحیح بتاتے ہیں۔ جنگل میں ہونے والی آہٹ یا سرسراہٹ سے یہ بتا دیتے ہیں کہ کونسا درندہ ہے اور کس موڈ میں ہے۔ ہوا سونگھ کر بتا سکتے ہیں کہ بادل کہاں سے آ رہے ہیں اور کتنی دیر میں بارش ہوگی یہ خصوصیات صرف ایک ابورجینی میں نہیں ہے بلکہ سب اس صلاحیتوں سے مالا مال ہیں Crocodile Dundff نامی فلم میں ان کی ان خصوصیات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ ابھی تک Aborigines پتھر دور کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے ہاں سرے سے کوئی تہذیب ہی نہیں۔ یہ لوگ درختوں اور جھاڑیوں پر رہتے ہیں۔ ہر قسم کے کیڑے مکوڑے اور جانور کھاتے ہیں۔ ان کی کوئی باقاعدہ زبان نہیں ہے۔ پتوں سے اپنے جسموں کو ڈھانپتے ہیں۔

ماہرین بشریات (Anthropologists) اور ماہرین نفسیات سالہا سال تک ان کے بارے میں تحقیق کرتے رہے ہیں کہ ان میں یہ قدرتی طور پر صلاحیتیں کس

طرح پیدا ہوگئی ہیں۔ کیونکہ ان میں پائی جانے والی صلاحیتیں انسان کی بقاء کے لئے بہت اہم ہیں جبکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں رہنے والے انسانوں میں پیدا نہیں ہوسکیں۔ مسلسل تحقیق کے نتیجے میں ماہرین نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ یہ افراد اس نام نہاد تہذیب جو کہ پچھلے ڈھائی تین ہزار سال میں پروان چڑھی ہے، کی منفی خصوصیات مثلاً جھوٹ، دھوکہ دہی سے بالکل ناآشنا ہیں کیونکہ ان لوگوں کے پاس کوئی ایسی مادی اشیاء ہی نہیں ہیں جن کے حصول کے لئے دھوکا دیں، جھوٹ بولیں۔ لہٰذا ان تصورات کا ان کے ہاں کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ ان لوگوں کے شعور اور لاشعور میں کوئی کشمکش ہی نہیں۔ نتیجہ یہ کہ ان کے دماغ کی اعلیٰ صلاحیتیں خود بخود جاگ گئی ہیں جن کے بارے میں ماہرین نفسیات و مابعد النفسیات بحث مباحثے کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں انسانی ذہن کے لئے جھوٹ اور دھوکا دہی سے زیادہ تباہ کن چیز کوئی نہیں جس سے اس کی قدرتی اعلیٰ صلاحیتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ یہی منفی عادات، ذہن کی ترقی و توانائی میں رکاوٹ ڈالتی ہیں یوں انسان آہستہ آہستہ ذہنی و دماغی امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔

اجتماعی طور پر ہم نے ''حضور ﷺ کے کردار'' والی تہذیب اپنائی ہوتی اور سارا معاشرہ اس پر کاربند ہوتا تو ڈیڑھ ہزار سال میں انسان کی اعلیٰ صلاحیتیں خود بخود بیدار ہو چکی ہوتیں۔ یوں انسانی تہذیب مادی اور روحانی طور پر مثبت انداز میں ترقی کر رہی ہوتی۔ ہم نفسیاتی امراض کے بجائے اعلیٰ نفسیاتی صلاحیتوں کے نہ جانے کس ارتقائی مقام پر ہوتے۔ سائنس اور نفسیات کی شکل وصورت ہی کچھ اور ہوتی ہم اس قلبی سکون سے آشنا ہوتے جس کے لئے ہم ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ انسانیت اسی دنیا میں ''جنت'' کے مزے لوٹ رہی ہوتی۔

لیکن افسوس صد افسوس کہ ملوکیت، سرمایہ پرستی اور مذہبی پیشوائیت نے نبیؐ کی اس انسانیت ساز تہذیب پر پردہ ڈال دیا اور انسانوں اور انسانیت کو تباہی و بربادی کے گڑھے میں گرا دیا۔

انسانیت کی اس تباہی میں ہم نام نہاد مسلمان سب سے بڑے مجرم ہیں جو نہ خود قرآن سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو اس سے مستفید ہونے کے لئے اس کو آزاد کرتے ہیں۔ اس جرم کی سزا، اس دنیا میں ہمیں بھوک، جہالت اور فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں مل رہی ہے اور مرنے کے بعد تو جہنم کا آخری طبقہ تو ہمارا منتظر ہے ہی کہ منافقت کے بارے میں، قرآن کا یہ اعلان بہت واضح ہے۔

پیپلز کلیرنگ ایجنسی

کسٹم ہاؤس سے منظور شدہ

کلیرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنٹ

۲۵ سالہ تجربہ کار

کلیرنگ اور فارورڈنگ کے معاملات میں ایک قدم آگے

ہمارے ۲۵ سالہ تجربہ سے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ فائدہ۔

ہم آپکی خدمت کیلئے ہمہ وقت تیار ہیں۔

۵۔ وقار سینٹر، فرسٹ فلور رام بھارتی اسٹریٹ، جوڑیا بازار۔ کراچی

فون: ۲۴۲۶۱۲۸ ۲۴۳۱۰۴۵-۲۴۳۷۵۳۷

فیکس نمبر:-

ٹیلیکس: ۲۱۰۴۳ BTC PK

اقبال! ترے دیس کا کیا حال سناؤں

(امیر الاسلام ہاشمی)

دہقان تو مر کھپ گیا اب کس کو جگاؤں — ملتا ہے کہاں خوشۂ گندم کہ جلاؤں
شاہین کا ہے گنبد شاہی پہ بسیرا — کنجشک فرومایہ کو اب کس سے لڑاؤں
اقبال ترے دیس کا کیا حال سناؤں

ہر داڑھی میں تنکا ہے، ہر اک آنکھ میں شہتیر — مومن کی نگاہوں سے بدلتی نہیں تقدیر
توحید کی تلوار سے خالی ہیں نیامیں — اب ذوق یقیں سے نہیں کٹتی کوئی زنجیر
اقبال ترے دیس کا کیا حال سناؤں

شاہیں کا جہاں آج ممولے کا جہاں ہے — ملتی ہوئی ملا سے مجاہد کی اذاں ہے
مانا کہ ستاروں سے بھی آگے ہیں جہاں اور — شاہیں میں مگر طاقت پرواز کہاں ہے
اقبال ترے دیس کا کیا حال سناؤں

مر مر کی سلوں سے کوئی بے زار نہیں ہے — رہنے کو حرم میں کوئی تیار نہیں ہے
کہنے کو ہر اک شخص مسلمان ہے، لیکن — دیکھو تو کہیں نام کو کردار نہیں ہے
اقبال ترے دیس کا کیا حال سناؤں

بیباکی و حق گوئی سے گھبراتا ہے مومن — مکاری و روباہی پہ اتراتا ہے مومن
جس رزق سے پرواز میں کوتاہی کا ڈر ہو — وہ رزق بڑے شوق سے اب کھاتا ہے مومن
اقبال ترے دیس کا کیا حال سناؤں

پیدا کبھی ہوتی تھی سحر جس کی اذاں سے — اس بندہ مومن کو میں اب لاؤں کہاں سے
وہ سجدہ زمیں جس سے لرز جاتی تھی یارو! — اک بار تھا ہم چھٹ گئے اس بار گراں سے
اقبال ترے دیس کا کیا حال سناؤں

جھگڑے ہیں یہاں صوبوں کے ذاتوں کے نسب کے — اگتے ہیں تہ سایۂ گل خار غضب کے
یہ دیس ہے سب کا مگر اس کا نہیں کوئی — اس کے تن خستہ پہ تو اب دانت ہیں سب کے
اقبال ترے دیس کا کیا حال سناؤں

محمودوں کی صف آج ایازوں سے پرے ہے — جمہور سے سلطانی جمہور ڈرے ہے
تھامے ہوئے دامن ہے یہاں پر جو خودی کا — مر مر کے جئے ہے کبھی جی، جی کے مرے ہے
اقبال ترے دیس کا کیا حال سناؤں

دیکھو تو ذرا محلوں کے پردوں کو اٹھا کر — شمشیر و سناں رکھی ہیں طاقوں پہ سجا کر
آتے ہیں نظر مسند شاہی پہ رنگیلے — تقدیر امم سو گئی طاؤس پہ آ کر
اقبال ترے دیس کا کیا حال سناؤں

مکاری و عیاری و غداری و ہیجان — اب بنتا ہے ان چار عناصر سے مسلمان
قاری اسے کہنا تو بڑی بات ہے یارو! — اس نے تو کبھی کھول کے دیکھا نہیں قرآن
اقبال ترے دیس کا کیا حال سناؤں

کردار کا گفتار کا اعمال کا مومن — قائل نہیں ایسے کسی جنجال کا مومن
سرحد کا ہے مومن کوئی بنگال کا مومن — ڈھونڈے سے بھی ملتا نہیں قرآن کا مومن
اقبال ترے دیس کا کیا حال سناؤں

قارئین محترم

(1) ادارہ طلوع اسلام کا اکاؤنٹ نمبر **3082-7** نیشنل بنک آف پاکستان، مین مارکیٹ گلبرگ 2 لاہور ہے۔

(2) اگر آپ (Direct) رقم ادارہ کے اکاؤنٹ میں بھیجیں تو ادارہ کو اس رقم کے بارے میں اطلاع دیں کہ کون سے بنک کی وساطت سے رقم بھیج رہے ہیں اور کتنی رقم ہے۔ نیز وہ رقم کون سے فنڈ کے لئے ہے تاکہ اس کے بارے میں بروقت معلوم کیا جا سکے۔

(3) اگر آپ لوکل شمارہ کے لئے رقم مبلغ -/170 روپے بھیج رہے ہیں تو آپ برائے مہربانی ڈرافٹ بنوا کر بھجوائیں تاکہ بروقت اسے ادارہ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرایا جا سکے۔ اگر آپ لاہور سے باہر کسی دوسرے شہر کا چیک ارسال کرنا ہی مناسب سمجھیں تو درج ذیل حساب سے رقم ارسال کریں۔

(i)	**شمارہ ایک سال کے لئے**	170 روپے
(ii)	**بنک چارجز**	70 روپے
	کل رقم	240 روپے

(4) میگزین کے لفافہ پر جہاں آپ کا ایڈریس درج ہوتا ہے اوپر یہ عبارت درج ہوتی ہے **Subscription Paid up to 12/2001** یا کوئی اور مہینہ لکھا ہوگا۔ آپ براہ مہربانی اس عبارت کو ہر مہینہ شمارہ ملنے پر پڑھیں۔ اگر آپ کا زرشرکت ختم ہو رہا ہو تو رقم ارسال کر دیں تاکہ یاددہانی کی ضرورت پیش نہ آئے۔

(5) اگر آپ شمارہ جاری نہ رکھنا چاہتے ہوں تو زرشرکت ختم ہونے سے پہلے ادارہ کو مطلع کریں تاکہ شمارہ بند کیا جا سکے۔

(6) اگر آپ اپنا ایڈریس تبدیل کرانا چاہتے ہوں تو ادارہ کو اس کے متعلق ہر ماہ کی 15 تاریخ تک مطلع کریں۔ بصورت دیگر شمارہ پہلے ایڈریس پر ہی روانہ کیا جائے گا۔

(7) مجلّہ طلوع اسلام کے زرشرکت کے لئے منی آرڈر بھیجتے وقت اپنا ایڈریس صاف اور خوشخط لکھیں تاکہ ایڈریس میں غلطی کا امکان نہ ہو۔ شکریہ

ایاز حسین انصاری

چیئرمین ادارہ

پاکستان میں

علامہ غلام احمد پرویزؒ

کا درس قرآن کریم مندرجہ ذیل منظور شدہ مقامات پر ہوتا ہے

شہر	مقام	دن	وقت
ایبٹ آباد	234 کے۔ ایل کیہال۔ رابطہ: گل بہار صاحبہ	بروز منگل	4 بجے شام
ایبٹ آباد	234 کے۔ ایل کیہال۔ رابطہ: شیخ صلاح الدین Ph:34699	بدھ	4 بجے شام
اوکاڑہ	برمکان احمد علی A-180 شادمان کالونی رابطہ: شیخ احسان الحق فون: 0442-510718	جمعۃ المبارک	3 بجے شام
بوریوالا	رہائش گاہ ڈاکٹر محمد اسلم نوید، فون 54590 ینگ تیاں میڈیکل سنٹر، 7/1 سول لائنز	دوسرا اور چوتھا جمعہ	ساڑھے 3 بجے
پشاور	دفتر جناب عبداللہ ثانی صاحب ایڈووکیٹ۔ کابلی بازار رابطہ فون: 840945	ہر بدھ و جمعہ	5 بجے شام
پشاور	افغان کالونی، بلاک (بی) حسین خان سٹریٹ، گلی 3، ٹیوب ویل چوک، مین روڈ، رابطہ: ڈاکٹر بشیر الحق	جمعۃ المبارک	4 بجے شام
پیر محل	مکان نمبر 139/140- مدینہ پارک	ہر ماہ پہلا اتوار	9 بجے صبح
پنج کسی	برمطب حکیم احمد دین	جمعۃ المبارک	3 بجے شام
جہلم	برمکان محترم قمر پرویز مجاہد آباد، جی۔ ٹی روڈ	اتوار	9 بجے صبح
جلالپور جٹاں	یونائیٹڈ مسلم ہسپتال	جمعرات	10 بجے صبح
چنیوٹ	ڈیرہ میاں احسان الٰہی کونسلر بلدیہ پیر ہٹہ بازار	جمعۃ المبارک	بعد نماز جمعہ
چک 215 ای۔ بی	شاہین پٹرولیم، اڈا کوارٹر	اتوار	9 بجے صبح
چوٹی زیریں	ارشاد احمد لغاری، لغاری برادر، زرعی سروس، D.G.Khan	جمعۃ المبارک	بعد نماز جمعہ
حیدر آباد	محترم ایاز حسین انصاری B-12، حیدر آباد ٹاؤن، فیز نمبر 2 قاسم آباد بالمقابل نسیم نگر، آخری بس شاپ۔ رابطہ فون 654906	جمعۃ المبارک	بعد نماز عصر
خان پور	بمقام مکان حبیب الرحمان، محلہ نظام آباد، وارڈ نمبر 9	ہر اتوار	شام 6 بجے
	خان پور، ضلع رحیم یار خان۔ زبانی درس و تدریس کا سلسلہ	جمعۃ المبارک	3 بجے
راولپنڈی	فرسٹ فلور، کمرہ نمبر 114، فیضان پلازہ۔ کمیٹی چوک	جمعۃ المبارک	4 بجے شام

	رابطہ۔ چوہدری نثار احمد۔ فون: 5542985-5774752	اتوار	4 بجے شام
سرگودھا	4-B گلی نمبر 7 بلاک 21 نزد مکی مسجد چاندنی چوک رابطہ: ملک محمد اقبال فون (711233)	منگل	7 بجے شام
فیصل آباد	23- سی پیپلز کالونی (نزد تیزاب مل) رابطہ: ڈاکٹر محمد حیات ملک۔ فون: 720096	جمعۃ المبارک	3.30 بجے شام
کراچی	105- سی بریز پلازہ، شاہراہ فیصل رابطہ کرنل خان ادیب احمد۔ فون: 4550546-4558498	اتوار جمعۃ المبارک	9 بجے صبح 5 بجے شام
کراچی	ڈبل سٹوری نمبر 16 گلشن مارکیٹ، 36/C ایریا کورنگی 5 رابطہ محمد سرور، فون: 312631-5046409 درس کے علاوہ بھی لائبریری کھلی رہتی ہے۔	اتوار جمعۃ المبارک	11.30 بجے صبح بعد نماز مغرب
کراچی	408 پارک ایونیو، شاہراہ فیصل رابطہ: محمد اقبال، فون 5892083	ہر اتوار	10 بجے صبح
کوئٹہ	صابر ہومیو فارمیسی توغی روڈ۔ رابطہ فون: 825736	اتوار	4 بجے شام
گوجرانوالہ	شوکت نرسری گل روڈ، سول لائنز	جمعۃ المبارک	بعد از نماز جمعہ
گجرات	مرزا ہسپتال، کچہری روڈ	جمعرات	3 شام
لاہور	25- بی گلبرگ II (نزد مین مارکیٹ)	اتوار	9 بجے صبح
ملتان	شاہ سنز بیرون پاک گیٹ	جمعۃ المبارک	5 بجے شام
منگورہ سوات	ڈیرہ اقبال ادریس، عقب مہران ہوٹل گرین چوک رابطہ جہانگیر خان، ڈھیرئے بابا، نزد ایئرپورٹ فون 812267	جمعۃ المبارک	بعد نماز جمعہ
منڈی بہاؤالدین	خان محمد، گلی نمبر 1، محلہ صوفی پورہ	جمعۃ المبارک	3 بجے
نواں کلی، صوابی	رابطہ بابو اسرار اللہ خان معرفت ہومیو ڈاکٹر ایم۔ فاروق، محلہ خدر خیل	اتوار	صبح 10 بجے

علامہ غلام احمد پرویزؒ کی جملہ تصانیف اور ماہنامہ طلوع اسلام کا تازہ شمارہ بھی انہی جگہوں پر دستیاب ہے۔

تحریک طلوع اسلام سے متعلق استفسارات مندرجہ بالا مقامات پر موجود کارکنان تحریک کے حوالہ کیجئے۔ جواب ادارہ سے براہ راست دیا جائیگا۔

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لئے خوشخبری

(نایاب) آسان قرآن مجید (نیوز)' مع تفسیر القرآن بالقرآن' از۔ تلمیذ سرسید جناب علی احمد خان دانشمند جالندھری (علیگ)

رعایتی قیمت پر =/200 روپے کی بجائے صرف =/100 روپے میں طلب کریں (علاوہ ڈاک خرچ)

مذکورہ تفسیر کے آخری پارہ کے چند نوٹس ملاحظہ ہوں۔

''سورۃ عبس (آیات 1-16) عام طور پر اس سورۃ کا غلط ترجمہ کر کے اسے پیغمبر ﷺ کی طرف منسوب کیا ہوا ہے۔ درآنحالیکہ یہ تو ایک روحانی اندھے کافر کے لئے ہے۔ مومن اندھے کے لئے نہیں ہے۔ نہ پیغمبر ﷺ نے مومن اندھے کے لئے تیوری چڑھائی نہ پیٹھ پھیری۔ یہ تمام حرکات تو روحانی اندھے کافر کی ہیں۔ سورۃ المدثر میں بھی ایسے ہی روحانی اندھے کافر کی حرکات ہیں۔ دشمن قرآن نے بہت سی جھوٹی روایات بنا بنا کر قرآن حکیم کی روشنی پر سیاہ غلاف چڑھانے چاہے لیکن سورج پر کون سیاہ غلاف چڑھا سکتا ہے''۔

''سورۃ الفیل آیات (1-5) پس مکہ معظمہ کے دانائے کار جرنیل حضرت عبدالمطلب نے اپنے ہمراہ تمام اہل مکہ کو لے کر جس کا ہر فرد ایک جانباز سپاہی تھا مکہ کی پہاڑیوں پر چڑھ گئے اور اصحاب فیل پر اچانک ایسا سخت جوابی حملہ کیا کہ ہاتھیوں نے اپنی فوج کو خود ہی روند ڈالا۔ پھر کیا تھا نہ ابرہہ اور نہ اس کی فوج کا ایک فرد زندہ بچ کر نکل سکا۔ سورۃ یٰسین کی آیات 14 تا 30 دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی گمراہ قوم کو عذاب دینے کے لئے کبھی آسمان سے لشکر نہیں اتارے اور نہ وہ اتارنے والا ہے''۔

ملنے کا پتہ :- مکتبہ اخوت' الکریم مارکیٹ' سیکنڈ فلور' اردو بازار' لاہور۔

ضرورت رشتہ

ایبٹ آباد کے رہائش پذیر ایک سابقہ فوجی گھرانے کی دو دختران کے لئے مناسب رشتہ کی ضرورت ہے۔ بڑی دختر نے ایم۔بی۔بی۔ایس کا فائنل اور چھوٹی دختر نے ایم۔بی۔بی۔ایس کے سال اول کا امتحان پاس کر رکھا ہے۔ خواہش مند حضرات سے درخواست ہے کہ وہ بذریعہ خط درج ذیل پتہ پر رابطہ فرمائیں:-

معرفت شیخ صلاح الدین' نمائندہ بزم طلوع اسلام ایبٹ آباد

KL-234' کیہال پبلک سکول' کیہال' ایبٹ آباد۔ PH:334699

حیدر آباد (قاسم آباد) سندھ میں

سلسلہ وار قرآن کریم سے قرآن کریم کی تفسیر کا اہتمام (بذریعہ ویڈیو کیسٹ) درج ذیل مقام پر کیا گیا ہے۔

12-B حیدر آباد ٹاؤن فیز 2' بالمقابل نسیم نگر' قاسم آباد (آخری بس سٹاپ کے سامنے)۔ حیدر آباد

بروز جمعتہ المبارک بعد نماز عصر' دعوت عام ہے تشریف لائیں

قرآنی لٹریچر' جملہ مطبوعات طلوع اسلام ٹرسٹ' مجلّہ طلوع اسلام کے تازہ شمارے درس کے دوران 35% رعایت کے ساتھ حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

رابطہ:- ایاز حسین انصاری' نمائندہ بزم طلوع اسلام قاسم آباد' حیدر آباد (سندھ)' ٹیلی فون حیدر آباد :- 654906

خریدار حضرات توجہ فرمائیں

مجلّہ طلوع اسلام کی درج ذیل خوبصورت جلدیں 180 روپے فی جلد علاوہ ڈاک خرچ دستیاب ہیں۔

70, 72, 73, 75, 76, 77, 78, 83, 84, 85, 86, 87, 88, 91, 94, 95, 96, 97, 99, 2000

ملک حنیف وجدانی، مری

"نغمہ رحمت"

بھیک کے ٹکڑوں والے دیکھے، دربانوں کی حسرت
لٹتی عزت انسانوں کی، دیکھی سستی شہرت

اللہ! پاکستان پہ رحمت کر دے، رحمت

درد یتیمی تنہائی میں، آنسو والا دیکھا
چاک گریباں دیکھے سارے، کرنے والے خدمت

اللہ! پاکستان پہ رحمت کر دے، رحمت

توڑ دو سب زنجیریں یارو، وقت کا نکتہ مانو
ہو انسان غلام کسی کا، یہ ہے اس کی ذلت

اللہ! پاکستان پہ رحمت کر دے، رحمت

مل جل کر، آباد کریں سب، پاکستان یہ پیارا
بنجر کوئی رہے نہ گوشہ، ہو باغات کی کثرت

اللہ! پاکستان پہ رحمت کر دے، رحمت

سورج چاند ستارے رحمت، برکت باد و باراں
کیاری کیاری جوبن لاوے، غیبی دست فطرت

اللہ! پاکستان پہ رحمت کر دے، رحمت

ہر صوبائی اور لسانی، فرق مٹا دیں بن کر بھائی
یوں پائے پھر پاکستانی مسلم ساری عزت

اللہ! پاکستان پہ رحمت کر دے، رحمت

قلبی وحدت، ذہنی قربت، قرآنی دستور!
اب "ربانی شوریٰ" سے ہو قائم اپنی الفت

اللہ! پاکستان پہ رحمت کر دے، رحمت

CM 6288
2-2-2001

قرآن کی تفسیر قرآن سے

تفسیرِ بیانُ لِلنّاس

خواجہ احمدُالدّین

مکمل سیٹ 7 حصے 4 جلدوں میں

اس تفسیر میں یہ پانچ خصوصیتیں ہیں جو اس کو عام تفاسیر سے ممتاز کرتی ہیں

- اس کے مخاطب بلالحاظ فرقہ و مذہب تمام انسان ہیں جیسا کہ قرآن کا شیوہ ہے۔
- اس میں حتیٰ الوسع کوشش کی گئی ہے کہ کوئی بات عقل سلیم کے خلاف نہ ہو۔
- ترجمہ میں سب سے پہلے اصول عربیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔
- اس کے بعد عام منشائے قرآن کا تتبع ہے جو محکمات سے واضح ہے۔
- اس کے ساتھ ہی سنت اللہ یعنی نیچر کے قوانین کا احترام کیا گیا ہے۔"

Price Complete Set Rs. 2000/-

دوست ایسوسی ایٹس

ناشران و تاجران کتب

الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور

Phone : 7122981 Fax : 092-42-7122981

DARS-E-QURAN

IN ENGLAND

UNDER THE MANAGEMENT OF BAZM TOLU-E-ISLAM LONDON

Place	Day	Time
76 Park Road, ILford, Essex IGI 1SF	First Sunday of the Month Ph: 020-8553-1896 E-mail: maqbool.farhat@virgin.net	14.30
53 Downlands Drive Southgate West Crawley West Sussex RH11 8QZ	Every last Sunday of the Month *Contact* M.Khalil: Ph: 01293 446258 Or Arshad Mahmood:01293 419 784	14.30
373 Whitton Dene Hounslow Middlesex TW7 7NF	Every 3rd Sunday of the Month Ph:Tariq Aziz: 020-8755-1099 Mobile: 07939 017117	14.30
Ladies Only 72 Herent Drive Clayhall ILford, Essex IG5 OHG	Every last Friday of the Month Ph:Rubina Khawaja: 020-8550-3893 Or Suriaya Farhat:020-8553-1896	12.30

calculated approach of decision—making makes sense when choosing which car to buy, or in determining guilt or innocence in a court of law. These decisions are based on gathering evidence and substantiating facts. But what does this have to do with philosophy? Isn't philosophy a matter of the heart, which is a very subjective source, where one should choose the path he/she finds most fulfilling? But by choosing one's philosophy based upon feelings alone is ultimately a choice to disregard the truth. If there is a possibility that truth is out there, ignoring it comes at a great cost—self-delusion. Therefore, we see, that Qur'an says, "that which we have revealed to thee of the book is the truth. (35:31)" Qur'an claims to contain the revealed law and philosophy, which has the solution to the problems of modern man. By revealed law and philosophy is meant that the source of knowledge is supra-rational, objective, and above emotional and personal experiences. They are beyond space and time and according to Iqbal it economises time and effort. All the laudable achievements in the last four or five hundred years would have avoided the unnecessary pain (at least there would have been no Hitler and no Stalin) and the latest modern institutions would avoid their pitfalls.

Asif Iqbal Khawaja is the student of UET, in the final year. He likes to describe himself as *"a free-lance Lahorite and a concerned friend of the fragile environment of this globe."*

****

DARS-E-QURAN (IN URDU)

BAZM TOLU-E-ISLAM MANCHESTER (U.K)

EVERY **FRIDAY** FROM **8PM – 9PM**

AT

33 ST. GEORGES ROAD, FALLOWFIELD

MANCHESTER, M14 6SX

DARS-E-QURAN AUDIO AND VIDEO TAPES (URDU) AND ALL THE PUBLICATIONS BY ALLAMA PARWEZ ARE AVAILABLE IN OUR LIBRARY FOR LENDING.

PLEASE CONTACT:- MR. MEHFOOZ (0161 286 5496)

OR MR. R.QURESHI:- TEL & FAX NO. (01565 830278)

- What are the constituents of a good education?
- What are various forms of governments and which one of them is the best?
- What is art and what is its importance in a society?
- What is religion and how does it affect the lives of humans?
- What is the process of history and what are the principles that make civilizations rise, grow, progress and decay?

There are only some of the questions philosophers pondered upon through the millennia and which gave rise to the theories of idealism, Materialism, Pragmatism, Realism, Dialectical Materialism, Existentialism, Logical Positivism and many others.

The very question that many people will ask after knowing about this subject would be, "what is the use of it?" In fact people do not benefit from this in direct tangible terms, but unless the use or utility of something is considered only in terms of bank notes, the use of philosophy cannot be depreciated. Even the bank notes are not ends in themselves but are means to achieve happiness and tranquility of mind. Now this very end is achieved by philosophy in a far better way and the quality of happiness is much superior in this case. In this respect Plato is justified in calling philosophy "a dear delight."

But even then, philosophy also has value regarding material wealth. Philosophy, by influencing politics, makes a society wealthier. Social Welfare State System of Scandinavia is a good example of this fact. The enormous development in sciences and technology with its practical benefits is a good deal owing to its philosophical background. The renowned Scientific Method, which is the standard method of attack in problems of Physics, Chemistry, Biology and other sciences, was initially presented by philosophers like Fracnis Bacon (17^{th} century, England.) The Inductive Method is also a gift of philosophy to science and mathematics. In shor, science cannot take the place of philosophy but itself raises philosophical questions.

Secondly, philosophy has had a very important indirect effect on the lives of those who even do not recognize this fact. It sieves down from books, elite opinions and media to shape the public opinions about world outlook. The Christian religion was made what it is to a great extent by the underlying Catholic philosophy of St. Augustine and St. Aquinas. The whole social structure of Russia was transformed under the influence of Dialectical and Historical Materialism. American constitution, to a considerable extent, is based upon the political philosophy of John Locke—a British Philosopher. Underneath the French Revolution of 1789, strong and steady currents of the philosophy of Rousseau flowed on. What horrors would the world have been spared had the Nazis had a better philosophy than Fascism.

Thirdly, it should be realized that philosophy is not to be valued for its indirect practical effects only, but for itself. Beliefs are useful because they are true, not true because they are useful.

There is a glut of opinions in the philosophy—market today. How do we decide which way to go? It's no different than other important decisions we make in life. This

accumulation of more knowledge does not guarantee in itself more cohesion and consistency in ideas. That is why a well-defined method is needed in philosophy.

(c) Philosophy is an attempt to gain a view of the whole:

Philosophy seeks to combine the results of various sciences and long human experiences in a clear and consistent whole or worldview. The philosopher wishes to see life not with a slant of a scientist, businessman or an artist, but with the overall view of someone cognizant of life as a totality, as C.D. Broad says, "Its object is to take over the results of the various sciences, to add to them the results of religious and ethical experiences of mankind and then to reflect upon the whole." The hope is that, by this means, we may be able to reach some general conclusions as to the nature of the universe and our position and prospects in it.

(d) Philosophy as the logical analysis of linguistics:

Some philosophers see the logical analysis of language and the classification of the meaning of words & concepts as the main function of philosophy—even some deem it the sole function of the subject. A.J. Ayer, Rudolf Carnap etc., belong to this school of thought. It would limit what we call knowledge to the observable facts and their interrelations.

(e) Philosophy is a group of problems as well as theories of their solution:

There are certain perennial problems & questions which interest mankind and philosophy tries to answer the same. Some of the problems of interest as presented in the following for the reader to have an appreciation of the scope of philosophy:

- Is the universe created by someone or is it self existing?
- Is there a beginning or end to the universe or is it eternal?
- Does God exist? If He exists, is He over and above the creation or is the creation part of Him?
- What is man's place and destiny in this universe? Is he a tiny lump of impure carbon and water impotently crawling on a small and unimportant planet or is he the most eminent of created things? Is he perhaps both at once?
- What is the nature and sources of valid knowledge?
- What is right and what is wrong?
- What is the nature of mind, soul, psyche and matter? Is this division between mind and matter a correct one? Is mind subject to matter or is it possessed of independent powers?
- Is beauty an essential quality of the beautiful or is it only a way of looking at the things?
- What is correct thinking and how to differentiate it from fallacies?
- Is there a way of living that is noble and another that is ignoble, or are all ways of living merely futile? But if indeed there's nobel way of living in what does it consist and how shall we achieve it?

VOICE OF YOUTH

AN INTRODUCTION TO PHILOSOPHY

By

Asif Iqbal Khawaja

****

The word philosophy is derived from two Greek words *"Philein"* or *"Philos"*—meaning love--- and *"Sophia"*--meaning wisdom. So literally philosophy means 'love of wisdom' or 'knowledge of wisdom'. Etymologically, the term *philosopher* means lover of wisdom and was first used by the Greek thinker Pythagoras (6th century BC, Greece) in a famous retort. When someone called him a wise man, he responded by saying that his wisdom only consisted in his knowing that he was ignorant and, therefore, he would like to be called philosopher i.e., lover of wisdom. No wonder Bertrand Russell calls him one of the most interesting and puzzling men in history!

A sarcastic person would define philosophy as everything and/or nothing, but this line of thought is not correct. In a general sense, the sum of a person's beliefs and convictions is his/her philosophy. This implies that every person has his/her own philosophy even though he/she may not realize it.

All people have some idea about God, nature, man, right, wrong, beauty etc. They acquire this knowledge through family, school, mosque (church, synagogue etc.), individual groups, books and modern electronic media like radio, television, newspaper, internet etc. This acquired philosophy may be a result of deep thinking or it may depend upon mere conviction, bias or tradition etc. This is a broad, popular, man-in-the-street view of philosophy, which is not acquired to distinguish philosophy as Weltanschauung and as a specific subject of study.

As a subject of study, philosophy can be looked upon from the following facets:

(a) Philosophy as a personal attitude towards life and universe:

It means taking things philosophically and looking deeper than the appearances. Philosophy begins in wonder, curiosity and doubt. To philosophize is not merely to know and read philosophy--rather it is to think and to feel philosophically.

(b) Philosophy is a mode of reflective thinking and reasoned enquiry:

It is synoptic as compared to the sciences. Its method is reflective and critical. Different philosophers have emphasized and accepted/rejected various methods like reasons, sense-perception, intuition, authority, revelation etc., to varying degrees. The mere

Conspiracy against the Quran

The publication of a letter in the January 29th edition of The Frontier Post captioned "Why Muslims hate Jews" by Ben Dzac, has caused riots and destruction of property in Peshawar. This unfortunate episode raises various issues to ponder on about human behavior, learn as we must from observation and experience.

By derisively fulminating against the Messenger Muhammad (PBUH), the writer of the letter, Ben Dzac has only manifested his own mentality as lack of scholarship, lack of tolerance and lack of respect for other human beings. He has exposed his own ugliness as an individual human being. This is sad, because Muhammad (PBUH) or anyone else for that matter, remains unharmed, it is the perpetrator of the venom who harms his own personality, his own development and his own dignity. If Ben Dzac does not accept Quran as of Divine source, he is free to reject it, for Divinity itself gives this right of choice to him.

As for the references to the Jews, it is one of the episodes in history among many others in the Quran. It projects the Quranic philosophy and science of history, stating that a particular behavior results in vitality of life, strength and creativity, while behavior opposed to it ends in decline and fall. The Jews of today have no responsibility for the generation Quran refers to. Anyone who violates the Laws of Nature will suffer in any given space and time. In any case this is a subject by itself. Ben Dzac should also be aware that what Ibn Ishaq writes (or any biographer or historian) is a human endeavor with all the limitations, subjectivity, and emotional prejudices of a human being. Again, this is also a subject by itself.

As for the rioters who went on a rampage led by the Jamiat-I-Islami (as reported by HERALD, February) it is a typical reaction of a people who are ridden by emotions and self-destructiveness. Apart from the main target, burning and destroying of private property of uninvolved and innocent public is generally their wont. Law and its implementation is a phenomenon unknown to them. The Quranic concept of the rule of law, whether it is the universe and the world of matter or human existence, they are all governed by universal and immutable laws. This terrible deed committed by Ben Dzac should have been taken to the Court of law by the people, and he be shamed by his own characterlessness, for those who abuse others are themselves abused. Also, the employee of the Frontier Post responsible for the blunder of such a publication could have been exposed rightfully guilty or innocent, careless or just stupid and dumb. All this could have been a lesson for the future for everyone.

(Shamim Anwar)

****

Can we who believe in Hadith, in all honesty say that our way of prayers is the genuine and true method of the Messenger Muhammad[PBUH]? Yet, each and every one of these sects claim that their way was the only way of the Messenger. And it does not make sense that all sects are correct. Are you prepared to believe that? Are you sure that during the times of the Messenger, some disciples offered their prayers like the Sunnis while other disciples offered their prayers like the Shiites do? Or that some prayed like 'Ahl e Hadith,' while others prayed like 'Hannafis'? Or that the Messenger himself offered his prayers like the Sunnis at one time, while at another time he offered like the Shiites? Or sometimes like 'Ahl e Hadith' and sometimes like 'Hannafis'? Obviously, we all know that it could not have been possible or behooving of the Messenger to adopt different manners at various times. There must have been one and only one way of praying by the Messenger and all his disciples must be offering prayers in one manner also. In Quran's language difference between sects means the wrath of God and bifurcation in the Din of Islam.

If that was the state of affairs in those times of the Messenger, is it possible that we in anyway, again can unite the Muslim brotherhood and see them praying in unison? Unfortunately, we think this shall not be possible, as long as you all will believe in the *hadiths* to be the true and authentic words of the Messenger. Until then it is not possible to achieve this unanimity. As every sect in Islam has his own *hadiths* and every one of them claims to be in the foot-steps of the Messenger. Leaving aside the question of uniting these Muslims, in the present scenario, we are faced with an even bigger dilemma, of which there is no panacea at all.

NEO-MUSLIM'S PLIGHT

Let us assume, that a Neo-Muslim embraces Islam today. And the *Maulana* who takes the oath and baptizes him/her, happens to belong to a Dayobundi sect. After embracing Islam he is told that the first and foremost requirement of Islam – that distinguishes a believer from a disbeliever – *is a prayer*. So he learns the wordings and manner of praying from that Maulana. Later on, a person from 'Ahl e Hadith' sect sees this individual praying and tells him that his prayers are not done. Now if his prayers are not accepted by the God, how can he remain a Muslim. As he was taught that a prayer divides a Muslim from a non-Muslim. Our question remains, can anyone of you give us a solution to resolve this innocent man's plight, who has embraced Islam? Please do not escape this issue and kindly give your serious consideration. The Hadith will not be able to resolve this matter as initially, this issue was created by the Hadith. We will discuss this matter later in the book.

(To be Continued.)

****

and a genuine version of the Messenger, when various different *hadiths* stand witness to every sect's way of praying. Our important question to you all is, are there any means existing today, by means of which we may know the exact manner, how the Messenger offered his prayers?

The answer to this question that these people give is, besides the Shiites, the differences in various factions of Sunni Muslims are flimsy and of no significance. Otherwise the procedures and manner of praying in all are the same. First of all it is all bunkum to say that these are flimsy differences and have no significance. The followers of one sect, leave alone the fact that they do not pray together, if by any chance a soft tone Quran reciter enters into the mosque of a high volume reciter, if they will not refurbish the floor of that mosque, it will at least be washed ten times and blessed ten times more.

What we read and listen now and then, to the riots in the mosques and between various sect members..... what does that mean? Or when we come to know that a certain Imam (headpriest) has been murdered, members getting at each others throats, the interference of police and the government locking up and sealing the mosques..... are these all due to trivial differences? And when these fanatics say that these differences are of no significance, it is sheer escapism from actual facts and an excuse to avoid the real meanings of a prayer.

It must be observed when a command or law is promulgated by the God (or His messenger), then the principle and its corollaries both are given their due importance; no way are these supposed to differ, by any means. For example, let us take the principle of *Wadhu* (ablutions) which is stated in the Quran that, we must wash our face and our hands upto the elbows. Now, if a person washes his hands upto the wrists and another upto the elbows, would you say that both of them are correct in doing so? As it is a trivial difference, is not the principle the same? It would certainly be incorrect to say that! Only he/she will be correct whose deed is according to the Quran. So to say that if anyone lifted his hands upto the ears or not, folded his arms on his chest or below the belly button, the space between his/her feet while standing for prayers, was too little or too much? Whether he recited to himself the sura 'fatiha' from the Quran after the Imam or not, and what phrases were uttered in a prayer? During the Ramadan, did he recite the *'Tarawi'* eight or twenty times? How many was the number of '*Takbeers*' in Eid prayers, so on and so forth, you are insinuating, are all matters of no significance? It is nothing else except escapism. If these people really believe that these trivialities are of no consequence, then just ask a staunch member of *Ahl e Hadith* sect to offer his prayers like the *Hannafi* sect does... He will not do so!

understand, that Hadith does not explain the whole of the Holy Quran. Only a few *ayats* of the Quran have been explained. In the Bukhari Hadith there is only one chapter devoted to the explanation of the Quran and that too of a few significant *ayats* from the Quran.

I repeat again what I wrote before, who would have the audacity, as not to bow his head before the verdict of the Messenger of Islam? In the present situation, where we cannot prove the verity of any *hadith*, if a person says that a *hadith* is not the true words of the Holy Messenger, it must not be construed that he is denying the Holy Messenger's explanation of Quran. What actually he is trying to convey is, what is being explained and attributed towards the Messenger, does not *ipso facto*, belong to Muhammad[PBUH].

Consider this, when Imam Bukhari discards 594,000 *hadiths* that he does not think to have been the words or deeds of the Messenger, then no one calls him to be a disbeliever. Why then a person, who has negated only one hadith, which is not according to his own study of the Quran, is exiled from the sphere of Islam and called a non-believer and a heretic. He actually is simply refusing to believe in the decision of the narrator of that *hadith*, that it is not the true statement of the Messenger. He is only negating the authenticity of that *hadith* which has been attributed towards the Messenger. *(Perhaps that is why the Messenger prohibited the writing of hadith, to his companions).*

HOW MUST WE PRAY WITHOUT HADITH

Let us examine another issue that seems very powerful and is the cause of frustration to many believers. It is usually said that if we do not believe in the Hadith, how are we to apply the tenets of the Holy Quran on ourselves. For example, it is mandatory to pray. Now nowhere does the Quran explain, as to how must we pray or what ought to be the manner and text in our prayers etc, etc. All we know, the Holy Messenger enacted on this mandate from God and we must follow in his foot-steps.

First of all it is absolutely incorrect to say, 'what if we do not believe in Hadith...' Noone is denying the deeds or words of the Messenger. Hadith books are available from every where. Actually the question ought to be rephrased that, "If we do not believe in the verity of Hadith, then how are we supposed to pray?"

We all know that Shia's way of praying is different from that of a Sunni. And both claim to be following in the foot-steps of the Messenger. When we look at Sunnis, their 'Ahl e Hadith' sect's way of praying is different from the 'Hannafi' sect. And everyone knows that. Again both of these sects claim to be in the foot-steps of the Messenger. The question is, whose way of praying ought we to consider as a true

Those of us who are comparatively less fiendish, are of the opinion that *hadith* is in fact an elucidation or explanation of the Quran. Actually these people only say this to please others. Their beliefs are very different from what they actually say. What they say is that *hadith* is an example of the Holy Quran, and they do not deny the consequences of this statement. They do not believe the *hadith* to be an explanation of the Quran, instead they believe the Hadith of being the actual *DEEN* (Islamic system). Hence Maulana Maudoodi (the same Maudoodi who was criticizing the *hadiths* a while ago) writes on this issue:

> *"If the negation of the permanence of Hadith means that it only explains the issues and topics of the Quran, and by itself the hadith is of no significance, then this proclamation is denying the facts... ..Hadith has its own permanent place, concerning mandates and issues. (Tarjuman ul Quran, July-August 1950)*

RECAPITULATION OF HADITH:

I. Hadith and the Holy Quran both have been revealed by God.

II. Hadith is an example of the Quran.

III. Hadith is not as dependent on the Quran as the Holy Quran is dependent on the Hadith.

IV. Hadith over rules the tenets of the Quran.

V. Hadith is not an explanation of the Holy Quran, actually Hadith has its own place.

VI. Hadith negates the Holy Quran.

And,

Anyone who does not have a belief in the above is denying the *hadith*, hence he is a heretic and an outcast from the sphere of Islam.

EXPLANATION OF QURAN

It is stated that the Quran was revealed to the Messenger Muhammad[PBUH]. Hence there can be no explanation of the Quran better than that of the Messenger. If someone extradites some other kind of meaning than the one explained by the Messenger, then he is not correct.

Apparently, this seems a very logical argument. Who would be audacious enough to contradict the Messenger, the question does not arise here – the important aspect to this argument is, whether the given data in the *hadith* is in fact the true and authentic statement of the Messenger? Concerning this issue it must be made to

"In those times there was paucity of literacy, and almost little means to have it written." (Tarjuman ul Quran, March 1954)

This was Maulana Maudoodi's answer. Dr. Hameed Ullah who is at present settled in Paris, has something else to say on this topic. He writes in one of his articles that was printed in the Karachi periodical 'Al Islam,' in its January 1-15, 1959 issue:

"The Messenger proved to be a man of modest and careful deeds. In the capacity of a Messenger of God, he had taken all possible and necessary steps to ensure that the message of God, not only was it delivered correctly to the people, but also that it was preserved. If he had adopted the same steps for his own deeds, he would have been taken for an egoist. That is why the Hadith story is different from the Quran."

This is the story of that Hadith, which is being placed next to Quran and which was revealed by archangel Gabrial just like the Quran. And by renouncing it we become heretics, in the same way we become a heretic by not believing in the Quran.

HADITH IS BEYOND QURAN

Uptil now we have noticed that it is being mentioned that Hadith is an example of the Holy Quran, meaning in other words, it is equivalent to the Quran. Now let us move a bit further. Maulana Auzaee states:

"Quran is more dependent on the Hadith books as compared with Hadith depending on the Holy Quran." (Jama e Biyaan ul Ilm, page 223)

HADITH CAN NEGATE QURAN

What this means is, that whenever there is a deadlock between Quran and Hadith, the *hadith* will over rule the Quran's verdict. Some *hadith* authorities even go beyond and proclaim that *hadith* can negate the tenets of Quran. The late Maulana Hafiz Muhammad Ayub ventures on this topic in his pamphlet, *'Fitna Inkar e Hadith'* that:

"It is not imperative for the Messenger's statements to go according to the Quran. Refering to Quran wherein is stated 2:180 (page 29). It is mandatory to willeth your riches to your parents, when you have wealth and are to die. Whereas the Holy Messenger said, 'It is not necessary for the heir to willeth.' Circumstances prove that the Holy Messenger's verdict has prevailed. Thus the hadith has negated the Holy Quran, as the Holy Messenger's statement has been enacted." (page 85)

"The archangel Gabriel brought the revelations of "Quran" and "Sunnat" (the lifestyle of the Messenger) together. The angel taught 'sunnat' to the Messenger just like the "Quran." That is why we do not differentiate in these 'revelations.' (Page 60)

TWO KINDS OF REVELATION

Meaning to say, that Quran and the Hadith, both are revelations of God and there is no difference between them. That is why a *hadith* was later on crafted, according to which the Holy Messenger told his disciples that I get revelations of Quran and Masla Ma'a (along with it similar and something else). Another concept was brought into use, that 'revelations' are of two kinds. The revelation called 'Jalli' (that means Quran) and the other revelation is 'Khaffe' (meaning the Hadith). The 'Jalli' revelation is also named 'Multoo' (which means a revelation that is recitable) and the other kind is 'Ghair Multoo' that cannot be recited. Please be advised here, that we have found no mention in the Quran and there is no clue of it even in the primary literature of *hadith*. This idea of two revelations actually belonged to the Jews. These writers have borrowed it from the Jews who believed in a revelation that could be written and the other that is not written (which means it was transferred through traditions). We do not want to involve ourselves here, as to how this concept is contrary to Quran and how it shatters its foundations. All we want to know is, that if God accepted the responsibility of the 'Holy Quran,' what came in his way, from taking the responsibility of the Hadith? The Messenger neither gave it to the Muslims, in any book form nor did the following Caliphs consider it essential to do so. Nor did any of the disciples of the Messenger bring it into writing. Whosoever had written the *hadith* had either publicly burnt it himself or had it burnt. If 'Quran' and 'Hadith' both were revelations, then why so much favoritism, care, and protection of one and no care at all for the other revelation? Can we by any means understand what this connotes? *(Or where these concepts are leading us to?)*

NO HADITH WAS WRITTEN

It would not be a bad idea at all to listen to the answers to our question. Maulana. Maudoodi writes that if Hadith had also been preserved as the Quran, then:

"The Quran would have at least become as big as Encyclopedia Britannica in volume."(Tafheemaat. Vol 1,page 236)

Because its volume would have increased so God did not include this part of revelation in the Quran. If we accept this argument, that the volume would be huge, then why was this revelation not written in a separate volume. To this the answer is:

III. More correctly, the quote means if you all have faith in the collectors of *Hadith* (book's authorities) and do not have faith in the vision of one who has insight into the temperament of the Messenger, then in his eyes you are a non-believer in *hadith* and thus a pagan. Again if you do not have faith in Imam Bukhari[R] and Imam Muslim[R] and deny them, then again according to 'Ahl e Hadith' sect you are denying *Hadith* and therefore a heretic.

In other words, God wanted you all to have faith in the messages sent through the holy Messenger, in order for you to be a true Muslim. Now the scenario that is made to prevail is, if you do not have faith in the above mentioned human beings, you cannot be called a Muslim.

BELIEF IN HADITH

This remains the *status quo* as far as *hadith* is concerned. Are you aware, what is being discussed in our religious circles? Please peruse carefully, and think again that if our belief in these hadiths is not the actual cause of confusion in DIN (Islamic system) what else is? Late Maulana M. Ismail (former president, 'Jamiat e Ahl e Hadith) writes in his periodical '*Jamaat e Islami ka Nazariya Hadith.*'

> *"The correct rank of hadith, after research, remains equivalent to the Holy Quran. In fact its denial will have the same consequences as the denial of Quran...Those hadiths that are proven perfect by the value standards and are chosen according to the choice of Sunnis cannot be denied. Otherwise you are an agnostic and an outcast from the Islamic community." (page 48)*

Meaning that not even one *hadith*, that has been proven true can be denied (to say, that it does not belong to the Holy Messenger). Otherwise it is tantamount to agnosticism and you are an alien in the sphere of Islam. According to the above mentioned sect, the Bukhari and Muslim books are considered '*Sahiheen*' (meaning it is the truth), therefore if whosoever denies any of these books is a '*Kafir*' (agnostic). It is written:

> *"The Muslims are united on Bukhari and Muslim...These hadiths are the absolute." (Page 55)*

The word 'Muslims' is meant for all those who belong to the Ahl e Hadith sect. This is because, the Hanafi sect that is considered the majority in the Muslim world, deny at least two hundred *hadiths* of Imam Bukhari[PBUH] and Imam Muslim[R].

HADITH IS REVELATION

As to why it is heresy to deny these *hadiths*, the late Maulana Ismail writes:

thoughts are flashing in my mind, if ever there can be a man/woman who can sense the finer sentiments of the Messenger, then what is hampering or coming in the way to adopt the Messenger's way of life. Muhammad's character is a balance of forgiveness, justice and sacrifice. How many of these authors have that balance in them. If they are capable of sensing those Messengeric qualities, then why do they not act upon them. Perhaps they have not reached those heights of character and are just talking about it. If they want to be righteous that is their choice, but why impose a righteous attitude if someone does not want it.) His insight is able to sense which words his Holy Majesty the Messenger of Allah could have uttered in a certain hadith, while dishonoring others that he does not sense, belong to the Messenger.

*Not only that, those matters about which he cannot find any reference in the Quran, can also be explained by that person, as he knows what could have been the Messenger's verdict. And this becomes possible as his spirit has become lost in the spirit of Muhammad*PBUH *and his insight is one with the vision of Messenger. After reaching that heightened stage an individual needs no warrants to check the viability of any hadith. There are times when he can pick up an old, outcasted, discontinued or dishonoured hadith, as he has that sense to make Messengeric decisions. At other times a hadith that is near to being credible, more popular and socially accepted may find no value according to him. As he finds no meaning to this golden drink of Islam that is in accordance with the sentiments of Islam and the Messenger."*

(Tafheemaat, vol. 1,page 323-24)

Let us scrutinize and examine rationally what has just been quoted above. What it actually means is:

I. You all ought to have faith in Imam Bukhari and Imam Muslim (and various other *hadith* scholars). The words 'have faith in' are not brought in for nothing. You have to have faith that what these above mentioned authors have written in *hadith* are the true statements of the Messenger of Islam. If you renounce, in that case you become a non-believer of *hadith*, heretic and therefore exiled from the sphere of Islam.

II. And if you renounce faith in the authorities on *hadith* then you ought to have faith in the vision of that individual who recognizes the Messenger's character. It means that you must believe in whatever he says, that those are the true words of the Messenger, inspite of the fact whether that statement is nowhere under the sun or is present in the *hadith* books. If you do not comply, you are considered a non-believer in Hadith, an agnostic and a pagan.

reflection that comes in our minds is, as to wherefrom this *hadith* has been quoted and how far is the *hadith* honorable.

The altercations among the Muslims are all due to this question of *hadiths* verity. One faction in Islam claims a hold on a certain belief and brings the *hadith* as its witness, while another sect plainly dishonours and brushes it aside, as not being the true words of the Messenger. These frictions among various sects are a thousand years old and there seems no immediate panacea for it. This is so because in the whole of Muslim world, we do not have any means to substantiate, that the *hadith* being quoted has the original words of the Messenger.

Also bear in mind, that nobody will ever say that we do believe in any one of these *ayats* to be from the Quran, or that some words have weakened in value over the passage of years. Quran's every *ayat* is as strong as it was the day it was revealed. There is no question about it. On the contrary, when a *hadith* is submitted to anyone, the party may relinquish the *hadith* as a piece of gossip. Since there are various kinds of Hadith books – and that also is the basis of all the squabbles between these different sects. At present there seems to be no cure in sight..... No! That is not so. We are told there is an answer, there is a panacea and there is a remedy available. There is one standard or measure that can tell whether a certain *hadith* is viable or not, and whether the Holy Messenger could have uttered those words or not. Not only that, even if there does not exist a *hadith* on a certain matter, we still can know what possibly the Holy Messenger could have said on that subject. Of course! it would be a subject of highest metaphysical interest to know of a source thirteen or fourteen hundred years after the departing of the Messenger.

Again Maulana Maudoodi's views on this are:

> *"The person who is bestowed the honor by Allah, develops by the study of Quran and the character of the Messenger, a certain kind of sense. This sense is analogous to the experience of an old jeweler, that is capable of recognizing the finer characteristics in a diamond. That person can realize the temperament of the whole Islamic system, by casting a bird's eye view. When the time comes to craft the details of this system, his developed sense guides him to discern the difference between Islamic and non-Islamic elements. The same sense becomes a rule and standard in the case of hadith also, that lets him decide the viability of a hadith. The culture and ethos of Islam can be realized in the life of the Messenger. A person who understands the distinguishing character of Islam and has done a thorough study of Quran and the character of Muhammad*[PBUH] *becomes capable of sensing the finer sentiments of the character of the Messenger. (As I am translating this quote,*

not bound by any means to believe in it, neither does my accepting it or not, will have any affect on my faith.

On the other side when Bukhari's *hadith* is put in front of me, in which it is written that "Messenger Abraham spoke 3 lies in his lifetime," and because *hadith* is part of my faith, it becomes my duty to believe in it. If I don't believe in this *hadith*, it would mean I am doubting the verdict of the Messenger. And if I believe in this *hadith* then I am alleging a respectworthy and an honorable Messenger of God (God forgive me) a lier.

Or say, you read in the newspapers that one man cut off another's nose. You are under no obligation to believe in it or not. And then you read Bukhari's *hadith*, wherein it is narrated, *"When the angel of death arrived in front of the Messenger Moses, he slapped the angel so hard that the angel lost one eye."* It becomes mandatory upon you to believe in this parable. If one doubts the story then you are doubting Islam. Now we must be confident after having discussed the vast difference. It is also hoped now that the difference has been adequately revealed, as to a belief that is part of our faith and a belief that involves our business or commercial lifestyle.

CONSEQUENCES OF A BELIEF

Let us take you on an insight of the practical implications of taking the *hadith* lightly. When we bring forth a Quranic *ayat* (sentence) linked to an issue in our daily life, it is quite possible the debating parties may not agree on the Quran's translation, or maybe hesitant to agree on its interpretation. However the case maybe, no one will ever deny that this *ayat* is not from the Quran. In our *hadiths* it is altogether a different story. Whenever someone quotes a *hadith*, the first question that comes to our minds is whether that *hadith* is true or not. Consequently, Maulana Abul A. Maudoodi writes:

> *"In actuality, any hadith attributed towards Muhammad PBUH, is always a controversial issue. It may be mandatory for you (or any other party) to believe in a hadith, that is approved by the narrators. This does not happen to be the case with us. We are not obligated to the narrator's approval in order to believe in the hadith to be true." (Risayal au Masayal, part one, page 290)*

We were discussing that in order to have a belief in a certain statement, it is indispensible for that statement or verdict to be truthful. When it is proclaimed that what we call DEEN, that is made of the Holy Quran and the Hadith, then it becomes incumbent upon both of these to be genuine and true. Whenever we say that Allah has proclaimed in Quran, then there does not exist the slightest bit of doubt about the verity of that statement. On the contrary, when we produce a *hadith*, the first

whose vision and insight has no parallel and who is suppose to lead the humanity and be a symbol of peace to them. A person's blood freezes in the veins when we read those kind of words attributed to such a great and noble man as Muhammad[PBUH].

That is why Maulana Abul A. Maudoodi felt compelled to write:

> *"It shall not be appropriate to claim, that all the hadiths that are in Bukhari must be accepted as they are, without any critical revision. (Quoted from Tarjuman ul Quran, Oct., Nov. 1952)*

The late Maulana Abul K. Azad gives us his opinion on Bukhari's Hadith, wherein it is said that 3 times in his lifetime, Messenger Abraham was forced to tell lies:

> *"From the various hadiths that we read, no matter how close it may seem to the truth, the innocence of the hadith cannot go further than the innocence of the mind of its narrator. Neither must the hadith be taken to go beyond our belief. We must admit that this hadith cannot be the words of the Holy Messenger. Definitely, somewhere the narrator of this hadith has made a mistake. And in admitting this fact neither the sky is going to fall nor the ground will break apart."*

Another Maulana Ubaid Ullah Sindhi goes even further and says, *'I feel embarrassed to ask a Neo-Muslim European to read Bukhari's Hadith.'* These were criticisms of individuals. The whole of the Hanafi sect does not believe in the two hundred or so *hadiths* present in Muslim and Bukhari.

It is usually asserted, that let us suppose the Hadith collection is not totally authentic, that it does contain a figment of writers' or narrators' imagination. And what is wrong with that? After all our whole business and commercial lifestyle is based on imagination too. Don't we believe in historical events, whether from a journalist's pen or read them in newspapers? How can we say those stories are in fact true? So why do we have to dishonor the *hadiths* if they have been slightly modified?

Apparently these seem to be cogent arguments. When we dig deeper, we will find how big the difference is, the curtain falls down and we become familiar with 'reality.' Newspapers or history is not a matter of belief for us. If I want I may accept a certain event, if I have arguments against it, without any second thoughts or hesitation I can relinquish. On the contrary, *hadith* we know has to do with our beliefs. That means it is beyond critique. Even the slightest doubt on *hadith* will shake our faith. Let us say, that we find in history the king, at such and such an event or at such and such a date told a lie. It is totally up to me to accept or reject it. I am

Shiite hadith. The Shiites also claim their hadith origins in Tabaeen[R] and companions[R] of Messenger Muhammad[PBUH].

It cannot even be imagined (at least by Sunnis) that those honorable narrators and writers of Hadith that are included in Shia *hadiths* are all (God forgive) liers. As the Holy Messengers companions were neither Sunni nor Shia – to which these *hadiths* are attributed. So they have no other choice left, expect to include the *hadith* from every sect in order to get the correct biography of the Messenger Muhammad[PBUH]. The present situation happens to be, that from a respectable source we get *hadiths* that are deemed correct in the Shia circles – yet both these *hadiths* of two different sects contradict each other. You tell us, as to which *hadith* ought to be considered genuine and true to the life of Messenger Muhammad[PBUH]. It is all the more difficult when we have to include the condition that the writer of *hadith* has to be honorable, trustworthy and sincere. This way no one can vouch for the authenticity of any *hadith*, gospel or parable. We may call it by any other name, sheer bigotry, party politics or whatever, except the true and authentic words of Muhammad[PBUH]. The great Bukhari[R] includes material for Hadith from sources which he himself considers to be untrustworthy.

(refer to *Mezaan ul Aitadaal az Allama Zuhby au Tadreeb al Ravi*)

These were the external sources by means of which we reach the conclusion, that neither Muhammad[PBUH] anywhere mentions *hadith* to be part of *Din* nor his companions believed it to be so. The collection of Hadiths that we possess today are also not the original words of Muhammad[PBUH]. The most cutting evidence that goes against these *hadiths* are its contents. Our spirit freezes and the pen shakes when we read what is narrated. We realize that the latter sentence of ours must have astonished the readers – it ought to do so too. As the Hadith is almost as sacred, respectworthy and close to the hearts as the Holy Quran. Obviously this kind of critical perusal from us ought to bamboozle and baffle you. You must neither listen to us nor anybody else and read what is written in Bukhari's collection and decide for yourself as to how far, what we have written, is correct. We also know and are sure that you are going to be persuaded by others. You may also be told to take into consideration the magnitude of respect that has been granted to authors like Imam Bukhari, whose book has been placed almost next to Quran. You will be condescendingly asked and urged not to believe in any kind of undermining or vile conversation. We sincerely plead to you again, the respects to the cadre and caliber of our ancestors is very close to our hearts also. When Imam Bukhari is there and available, why not read and confirm it for yourself, as to how far we are justified in writing about the Bukhari's Hadith. You will read words and sentences, that no one in his right frame of mind, will ever have the audacity to attribute towards the Holy Messenger. Especially to a personality

He further argues:

> *"By these examples we are not, by any means, connoting that their research is abracadabra. Our purpose is only to bring to surface the fact that the narrators were but only human. They were not above human imperfections. Is it then mandatory that whosoever they claim to be worthy of respect ought to be taken with respect." (page 321)*

And:

> *"All the elements of Hadith have been excavated as far as the human factor could take us. But it is not essential that in their researches they have succeeded in reaching the truth. There is every likelihood that the saying they claim to be true, may not in fact exist. This and other similar factors restrain us from drawing conclusions from the art of rational gleaning. Their research provides great material for the Messenger's lifetime and in researching the relics of the Messenger's companions, but they are not fool proof." (page 321-22)*

VERDICT

As far as personal inclinations are concerned we are entering a region where even the angels fear to tread. When a person passes a judgement on another whether he/she qualifies the morality standard or not, there is every bit of likelihood of involving our personal propensities. And these inclinations are founded and based on our set of beliefs. Imam Bukhari[R] was in disagreement with Imam Abu Hanifa[R] on the issue of fluctuations in faith in a person's lifetime. Consequently, he never considered the great Imam very honorably. Not only that, as the great Imam had his roots in Kufa, thenceforth all the citizens of Kufa were not considered to be trustworthy and incapable of transmitting the *hadith*. As Kufa was in Iraq, so all Iraqis were chips of the same block and he reached the decision that 99 out of 100 Iraqi *hadiths* ought to be counted as ambiguous. In the same way on a frivolous difference two great Imams, Imam Abu Hatim and Imam Abu Zra'a decreed Imam Bukhari[R] of being untrustworthy, and ceased all communications on *hadith* with him. Let us not forget that Bukhari and Muslim are the most trustworthy in the Islamic world and their works are called '*Sahiheen*' (the most perfect ones). In Hadith literature, we observe quite a bit of friction and conflict between these two narrators. This division in *hadith*, based on the conflict of belief can easily be observed by the existence of Shia and Sunni factions. As mentioned before, the Sunnis have their own collection of Hadith and claim their source coming from Tabaeen[R] and the Messenger's companions[R]. The teachings we gather from this resource are disparate from the

That is also why the statements in Hadith are not considered the original words of the Messenger. The statements in hadith are believed to be those that are referenced to Messenger's statements. And are not his exact words.

It is obvious, in the conventional parables, we come across numerous names of writers, on a single statement of the Messenger. After the compilation of *Hadith*, question arose as to the moral health and conduct of those who have refered these statements. For that we must take each and every hadith and check for the morals and character of its author. This is one of those arts, of which we can proudly boast and which is little known anywhere else. We do not have the faintest bit of doubt on the intention of narrators. Again the important question is, can we by this approach arrive at Truth? You can vouch for the individual's character who is saying the hadith to you, how can you say with authority that all the people who carried the words of Messenger were sincere at heart or could be depended on. It is not the question of having confidence in those writers, the most important aspect is, were they capable of thoroughly understanding a statement and giving the correct interpretation of it. If we can prove, that in two or two and a half centuries the words are capable of remaining in their original form, then I think we have solved the greatest mystery of our times..... It is impossible!

Maulana Abul A. Maudoodi has also something to say on this:

> *"These people (who believe the Hadith to be a part of Din), crushed the limits of justice. Now we should rank the Hadith according to the degree they have been granted. If for example when we read a stronger version, we must let go of its weaker counterpart. No doubt the material that is provided about the pioneers is of immense value for future narrators of Hadith. The only question is how far are these people completely trustworthy. After all they were all but human and we must not expect them to go beyond the scope of human limits. Nor can we guarantee they can compensate for the human lacuna. How are you to say for sure. that whatever they are relating is fool proof, when the writers themselves are not sure about it?" (Tafheemat, part I, page 318)*

He further writes:

> *"The respectful Hadith writers have provided gargantuan volumes of worthy treasure, but how can we say that it is absolutely beyond doubt. (page 319)*

He is not commenting on inadvertent mistakes, when he says:

> *"There is an evil in each one of us, and there lies a strong possibility, when forming an opinion, that it shall interdict."*

two years, this went on for a crucial period of two or two and a half centuries. *And these centuries, mind you, were full of conspiracies and intrigues against the Islamic ideology.* How much truth is left, when sentences have been moving from one mind to another for this prolonged period of time, I shall leave it for you to imagine?

BENEFIT OF DOUBT

It would be worthwhile to mention Maulana Abul A. Maudoodi's criticism here. In order to thoroughly understand the genius of the Messenger, (what to talk about the late comers in Hadith writing) he gives his critique on the pioneer Abu Huraira^{R} as follows:

> *"Apparently, it seems that either Abu Huraira^{R} was unable to comprehend Muhammad's statement or he did not hear him completely.....These kinds of misinterpretations are not uncommon in our Hadith literature, sometimes a saying has been clarified by another saying while there are others that are still more ambiguous." (Quoted from Tasneem, Ahadith number, Oct. 14, 1959)*

This was his viewpoint on the interpretation of the first compiler on Hadith. As far as transfering these interpretations to others is concerned, the same author narrates in his book (Tafheemaat, volume, 1) as follows:

> *"Let us say for example, I am giving a speech today and many thousands are listening to me. Few hours later, after I have finished my speech (not months or years, but only a few hours later), just ask the people as to what I was saying. It will be observed that all translations will be different from each other. Everyone will emphasize a different portion of the speech. Somebody will take down word for word whereas another will interpret that sentence according to his own understanding. One person will have a better mind and will give the correct meaning of it, whereas another with limited intellectual capacity, may garble the true meanings. One person maybe having a good memory and may give you a word for word translation, whereas another with a weak memory will make mistakes conveying the meaning to others."*

SAYINGS ATTRIBUTED TO THE MESSENGER

This was in fact the way in which the statements and parables of the Messenger traveled through two or two and a half centuries. That is absolutely the reason when one reads the Quran we say it in all belief, (قال اللہ تعالیٰ) "which Allah promulgates." When we begin to narrate any statement of Hadith we say 'The Messenger of Allah said...' And at the end we say (اوکما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) meaning 'otherwise or as the Messenger might have said.'

THE STATUS OF HADITH···

THE ACTUAL STATUS OF HADITH:

Chapter I Continued

Translated By
Abu B. Rana

****

From the above research, it is determined, the collection of parables and teachings of the Messenger was an individual effort without any warranty from Allah or any kind of consent from the Messenger. These findings also invite one to ponder as to what would have been the condition of the DIN (Quran), if it was thrown at the mercy of humankind.

It is widely discussed, we were fortunate that Imam Bukhari[R] and various other religious scholars were able to make a collection, otherwise we would have been (God forbid) robbed of our Islamic treasure. Some scholars go so far as to exclaim that only one tenth of the knowledge is in the Quran and the rest of nine tenths of the treasure is in the Hadiths. (*No wonder nine tenths of the time the world is at war with each other*). Please give your serious attention to this. A God who explicitly proclaims in the Quran that '**the system of Din is now complete**,' and after hearing that can we even for a moment imagine, that the last of the Messengers will leave so gargantuan amount of other knowledge about it at the mercy of fate? I have grave doubts if that will make any sense!

INTERPRETED HADITH

It could have been possible, as we had seen with the preserving of the Holy Quran, that the words of the Messenger be made to travel from heart to heart until they were compiled in the form of a book. Their authenticity could have been, to quite an extent vouched for. As we all know now, even this was not the story. The Hadith books that are present today, do not contain the original sayings of the Muhammad[PBUH]. These are interpretations of his gospel or sayings. As in common conversation and literature we find sentences with '*in other words……*' For example the Messenger's companion heard him say or utter something and reached his own conclusion and delivered it to another companion in a different tone, then the second one tried to understand and conveyed it to another companion: Now imagine this going on, not for one day or two days, one or two months, not even one year or

کامل مومن وہ ہے جو خوش اخلاق اور گھر والوں سے نرم سلوک کرنے والا ہو۔ (ترمذی)

A perfect believer is that who is nice in behaviour and kind to his family members. (Tirmizi)

SHAHAB

QUALITY PISTON RINGS

THE ONLY MANUFACTURERS OF INTERNATIONAL QUALITY PISTON RINGS IN PAKISTAN.

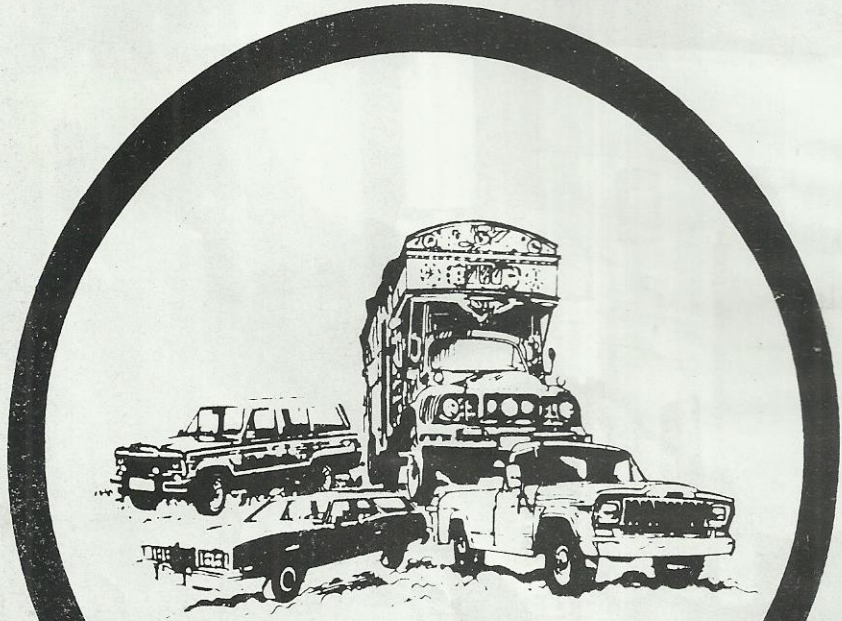

MINIMIZE WEAR
RESTORE COMPRESSION
GET MORE POWER
CONTROL OIL

CALL US FOR THE EXCELLENT RECONDITIONING OF AUTOMOBILE ENGINES OF ALL KINDS.

M. SHAH MOHAMMAD & SONS (PVT.) LTD.
OUTSIDE PAK GATE, MULTAN, PAKISTAN
PHONE OFFICES : 545071, 43671, 539071-73
FACTORY 550171

FOUNDED IN 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL® AND QUAID-E-AZAM®

R.L.No.
CPL - 22
VOL:54
ISSUE
03

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, PAKISTAN
Phone: 5714546, 5753666 Fax: 5866617
Email: idara@toluislam.com
Web Site: http://www.toluislam.com/

AMBER®

We are ISO 9001 certified!!

AMBER Range of Products:

Capacitors for Motor Start-Run, Fans, Blowers, Air Conditioners, Fluorescent Lamps, High Pressure/High Intensity Discharge Lamps, and, Power Factor Correction.

CUSTOMER SPECIFICATIONS ARE WELCOME!!

Amber Capacitors Limited
16-Link Mcleod Road, P. O. Box 468, Lahore, PAKISTAN.

Phone: +92 42 722 5865, 722 6975
Fax: +92 42 723 2807, 586 6617
Web Site: http://ambercaps.com/
Email: amber@ambercaps.com